UNIVERSAL
LIBRARY
OU_220603
UNIVERSAL
LIBRARY

Osmania University Library

Call No. ٨٩١ ٤٣٢٠ ۵ Accession No.

مجلہ عثمانیہ

Author

Title

This book should be returned on or before the date last marked below.

مجلۂ عثمانیہ

طلبۂ کلیہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن کا سہ ماہی رسالہ

مدیر: میر سعادت علی رضوی

ام۔ اے (عثمانیہ)

نائب مدیر: مرزا سرفراز علی

متعلم بی۔ اے

مطبع عہد آفریں حیدرآباد دکن میں چھپا

مجلۂ عثمانیہ

جلد ہشتم شمارۂ سوم و چہارم

(مجلس مشاورت)

ڈاکٹر اے، ایچ، میکنزی

ام، اے۔ ڈی، لٹ۔ سی، ایس، آئی۔ سی، آئی، ای

نائب معین امیر جامعہ عثمانیہ

(مشیر حصہ اردو)

مولوی عبدالحق صاحب بی۔ اے (علیگ) پروفیسر اردو جامعہ عثمانیہ

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور ام۔ اے، پی ایچ۔ ڈی (لندن) مددگار پروفیسر جامعہ عثمانیہ

(مشیر حصہ انگریزی)

مسٹر ای۔ ای۔ اسپیٹ بی۔ اے (لندن) پروفیسر انگریزی جامعہ عثمانیہ

(خازن اعزازی)

مولوی وحید الرحمن صاحب بی۔ ایس سی پروفیسر طبعیات

(معتمد اعزازی)

میر سعادت علی رضوی ام۔ اے (عثمانیہ) مہتمم مدیر

چندہ سالانہ پیشگی

۱ ۔	سرکار آصفیہ و برطانیہ سے	۱۲ روپیے
۲ ۔	ارباب جامعہ، اصحاب مقتدر اور اداروں سے	۸ ؍؍
۳ ۔	عام خریداروں سے	۶ ؍؍
۴ ۔	طلبائے قدیم، رفاہیہ انجمنوں اور دار المطالعوں سے	۵ ؍؍
۵ ۔	طلبائے کلیہ جامعہ عثمانیہ سے	۴ ؍؍
۶ ۔	ممالک بیرون ہند سے	۱۵ شلنگ
۷ ۔	بلاد یورپ کے طلبائے قدیم کلیہ جامعہ عثمانیہ سے	۱۰ ؍؍
۸ ۔	فی رسالہ	عا روپیے

ملنے کا پتہ

دفتر مجلہ عثمانیہ جامعہ عثمانیہ حیدر آباد دکن

مجلۂ عثمانیہ

سنہ ۱۳۴۴ف

جلد ہشتم — شمارہ سوم و چہارم

فہرست مضامین

نمبر شمار	مضمون	مضمون نگار	صفحہ
۱	اداریہ	مدیر	۱
۲	میر نوازش علی خاں شیدا	میر سعادت علی رضوی ام اے (عثمانیہ) مدیر	۱
۳	نظم طباطبائی اور انکی شاعری	نوراللہ محمد نوری (عثمانیہ)	۱۴
۴	بچے اور والدین	میر باقر علی ام۔اے	۳۵
۵	حیات دائمی	جمیل احمد برنی متعلم بی۔اے فائنل جامعہ عثمانیہ	۴۴
۶	بیجوں اور پھلوں کا انتشار	محمد ریاض الحسین متعلم سال دوم	۵۷
۷	اودھ میں اردو شاعری کی ابتداء	محمد اعظم خاں ام۔اے (عثمانیہ)	۶۵
۸	سکون حیات (نظم)	اختر حسین متعلم سال چہارم	۷۶
۹	اقبال کی غزلیں	وجد بی۔اے (عثمانیہ)	۷۸
۱۰	پریم پرچار (نظم)	میکش	۸۷

نمبر شمار	مضمون	مضمون نگار	صفحہ
۱۱	انقلابِ زندگی	محمد یحییٰ صدیقی ام۔اے (عثمانیہ)	۸۹
۱۲	سمندر سے خطاب (نظم)	وجد متعلم سال پنجم	۱۲۵
۱۳	!؟	عسمر مہاجر متعلم سال سوم	۱۲۶
۱۴	جوانی (نظم)	مخدوم محی الدین بی۔اے (عثمانیہ)	۱۳۲
۱۵	میرے چند دوست	اشفاق متعلم سال چہارم	۱۳۳
۱۶	پردیسی پریتم	صمد رضوی ساز	۱۳۹
۱۷	حیدرآباد کی جدید اردو مطبوعات	ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور	۱۴۱
۱۸	خطبۂ صدارت	ابوالخیر ابراہیم حسینی صدر انجمن اتحاد طلبائے جامعۂ عثمانیہ	۱۴۹
۱۹	تبصرے	مدیر و نائب مدیر	۱۵۴
۲۰	کلیہ کی خبریں	مرزا سرفراز علی نائب مدیر	۱۶۱

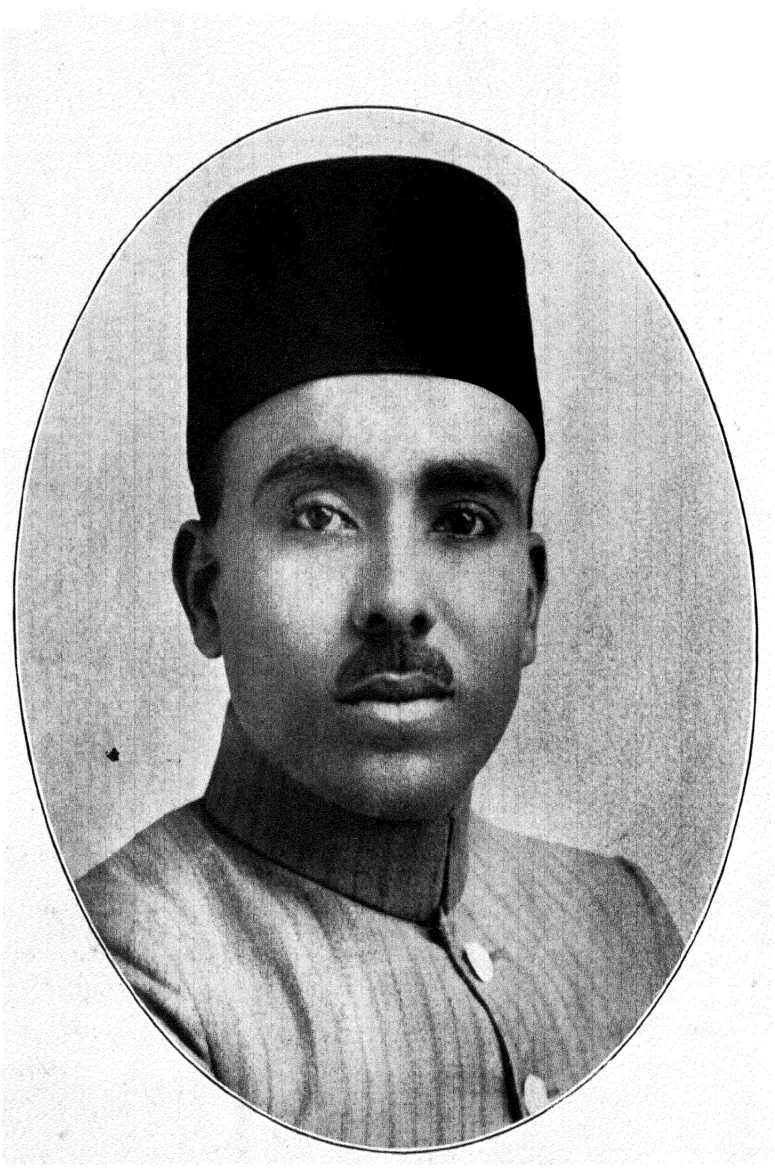

میر سعادت علی رضوی، ام۔اے (عثمانیہ)
مہتمم مُدیر و مدیر حصۂ اُردو، سابق صدر بزم اُردو

اداریہ

جلد ہشتم کی گزشتہ اشاعت میں ہم نے صرف طلبہ کے مضامین کا انتخاب کیا تھا اور مجلہ عثمانیہ کو حقیقی معنی میں "طلبۂ جامعہ عثمانیہ کا رسالہ" ثابت کرنے کی کامیاب کوشش کی تھی جس کا اثر یہ ہوا کہ دوسری اشاعت تک جامعہ کے اہل قلم کی وہ مغائرت باقی نہیں رہی جو مجلہ کے ساتھ اس سے پہلے انھیں تھی جب ان کو عملی طور پر یہ معلوم ہوگیا کہ ان کے 'قابل قدر' مضامین 'ناقابل اشاعت' نہیں قرار دئے جاتے تو صرف یہی نہیں ہوا کہ طلبہ کشادہ دلی کے ساتھ اپنی قلمی کاوشوں سے مجلہ کی امداد کرنے لگے بلکہ ان میں یہ ذوق وشوق پیدا ہونے لگا کہ 'اپنے مجلہ' کے لئے خاص مضامین لکھیں۔ ہم انھیں یقین دلاتے ہیں کہ اگر انھوں نے اس کوشش کو قائم رکھا اور اپنا معیار تحریر بلند کرتے رہے تو مجلہ عثمانیہ بغیر کسی عذر کے ان کے مضامین کی اشاعت کرتا رہے گا۔

یاد رہنا چاہئے کہ مجلہ عثمانیہ ایک ایسی جامعہ کا رسالہ ہے جو اس وقت ہندوستان میں اردو ادب کی واحد ذمہ دار ہے۔ اس میں ایسے مضامین شائع ہونے چاہئیں جو جامعہ کے اس ادبی مقصد کی

اچھی طرح نمایندگی کریں۔ صرف ناظرین کی تفریح طبع کا باعث نہوں بلکہ ان کی معلومات میں بھی اضافہ کرتے رہیں تاکہ اردو ادبی دنیا میں مجلہ عثمانیہ وقعت کے ساتھ دیکھا جائے۔

ہم نے اس اشاعت میں طلبہ کے تخلیقی مضامین کے علاوہ تحقیقی کارناموں کو بھی جگہ دی ہے چنانچہ شعبۂ اردو کے ام۔ اے کامیاب طلبہ کے مقالوں کا (جو انھوں نے ام۔ اے کے امتحان کے لئے لکھے تھے) اقتباس "نوازش علی خاں شیدا" اور "اودھ میں اردو شاعری کی ابتدا" کے عنوان سے پیش کیا گیا ہے۔ ان کے مطالعہ سے واضح ہوگا کہ یہ مضامین ایک ریسرچ اسکالر کی تحقیقات سے کسی طرح کم نہیں ہیں۔ جب مقالوں کے لکھنے میں طلبہ اپنے شفیق اساتذہ کی رہنمائی میں اتنی محنت اٹھائیں تو مختلف اور چیدہ چیدہ عنوانات پر مقالے لکھوانے سے بہتر یہ ہوگا کہ کوئی ایک عنوان مقرر کرکے اس کو مختلف حصوں میں تقسیم کیا جائے اور طلبہ سے ان ذیلی عنوانوں پر مقالے لکھوائے جائیں جن کو بعد میں اگر ایک جگہ کردیا جائے تو ہر سال ایک مستقل عنوان پر مکمل تحقیقی کام انجام پاکر اردو ادبیات میں بیش بہا اضافے کا باعث ہوگا ہمیں امید ہے کہ جامعہ کے ارباب متعلقہ ہماری اس ناچیز رائے پر غور فرمائیں گے۔

منتخب صدر صاحب انجمن اتحاد کا پرمغز خطبۂ صدارت جو جامعہ سے متعلق چند نہایت اہم ترمیمات پر مشتمل ہے قابل ستائش ہے اور جامعہ کے ارباب مجاز کو ان اہم مسائل کے حل کی طرف متوجہ کرکے ان کی مصروفیتوں میں اور اضافہ کر رہا ہے۔

مجلہ کی آنے والی ادارت کو مبارکباد دیتے ہوئے ہم یہ مشورہ دیتے ہیں کہ ہماری قائم کردہ اس روایت کو کہ "مجلہ میں طلبہ کے مضامین کی اکثریت کا ہمیشہ خیال رکھا جائے" برقرار رکھنے کی کوشش کریں اور اس طرح نوخیز مضمون نگاروں کی ہمت افزائی کرتے رہیں۔

ہمیں اس کا اعتراف ہے کہ شمارہ سوم و چہارم کی ضخامت پچھلے نمبر سے بہت کم ہے لیکن اس قلیل مہلت میں ہم سے جو کچھ بھی ممکن تھا ہم نے کیا ہمارے خیال میں مضامین کا معیار اگر اچھا ہو تو

ضخامت کو ایک حد تک نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔

ہم اپنے نائب مدیر صاحب کے نہایت ممنون ہیں کہ انھوں نے اپنا بہت سا وقت صرف کرکے ہمارا ہاتھ بٹایا اور ان قلمی معاونین کا بھی شکریہ ادا کرتے ہیں جنھوں نے ہماری خواہش پر مضامین لکھ کر دئیے اور ہمارے کام میں سہولت بہم پہنچائی۔

"مدیر"

میر نوازش علی خاں شیدا

از

میر سعادت علی رضوی ایم۔ اے عثمانیہ

۱۔ ذاتی حالات

میر نوازش علی نام ۔ شیدا تخلص ۔ سنہ ولادت و وفات کا ٹھیک طور پر علم نہ ہوسکا معلوم ہوتا ہے کہ شیدا بہ حیثیت شاعر کے نہ اپنی زندگی میں مشہور ہوئے اور نہ مرنے کے بعد۔ اس لئے کہ باوجود بارہویں صدی کے شاعر ہونے کے اس عہد کے تمام تذکرے ان کے حالات سے خالی ہیں۔ ہم نے تقریباً پچیس ایسے تذکرے اسی سلسلہ میں دیکھ ڈالے لیکن صرف دو میں ان کا ذکر ملا وہ بھی نا مکمل اور غیر تشفی بخش ۔

طبقات الشعراء مولفہ قدرت اللہ شوق میں جس کا سنہ تالیف ۱۲۰۱ھ ہے لکھا ہے کہ :-

”سید نوازش علی خاں خلف رشید مرتضیٰ خاں ایلچی ایران کہ برادر نواب محمد خاں بود از اوست“

”اگر باغ سے وہ سرو خراماں گذرے　　　　اشک قمری کا گلستاں منے طوفاں گذرے“

زبان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ شعر دکنی شاعر کا نہیں یا اگر ہے تو بعد کے زمانے کے کسی شاعر کا ہوگا اور یہ بھی بیقین سے نہیں کہا جاسکتا کہ یہ سید نوازش علی خاں مصنف روضتہ الاطہار ' شیدا ' ہی ہیں نہ معلوم شوق نے نام کے ساتھ

تخلص کیوں نہ لکھا۔

البتہ اسی عہد کا ایک اور تذکرہ 'ریاض حسینی' تالیف خواجہ عنایت اللہ خاں فتوت جس کا سنہ تالیف ۱۱۹۵ھ ہے دفتر نظامت ملکی ومال حیدرآباد میں ہماری نظر سے گذرا جس میں شیدا کا ذکر اس طرح ہے :۔

" نوازش علی خاں شیدا۔ مسکن وماوائش نجف بنیاد حیدرآباد وبہ میرسامانی بلدہ مذکور ماموراست اکثر مدح بادشاہ شہیدان دشت کربلا می گوید ودر نتیجہ شفاعت خود از آن دستاویزمی جویداز اوست"

چمن کی گلگشت کو لٹکنا یوں گھر سے جب خوش خرام نکلا | تیری ہوا کی ادا کے دیکھے ہلال کرنا سلام نکلا

اگرچہ کہنے تھے قمریاں سب چمن میں اشراف سرو پابن | جب ہم نے تحقیق کر کے دیکھے تمہارے قد کا غلام نکلا

نوٹ۔ تیسرے مصرع میں قرین قیاس یہ ہے کہ 'آزاد' کا لفظ ہوگا جسے کاتب کی غلطی نے 'اشراف' بنا دیا کیونکہ سرو کی مناسبت اور چوتھے مصرع میں لفظ 'غلام' کے لحاظ سے 'آزاد' کا لفظ ہی زیادہ موزوں معلوم ہوتا ہے۔

'ریاض حسینی' کی عبارت سے ہمیں اتنا وثوق ہوتا ہے کہ شیدا حیدرآباد ہی کے رہنے والے تھے اور علاوہ مرثیوں اور مذہبی نظموں (جن میں قصیدے اور مثنویاں شامل ہیں) کے کبھی کبھی غزل بھی کہتے تھے جس کے دو شعر مولف نے بطور نمونے کے پیش کیے ہیں۔

۲۔ عہدہ اور ملکی خدمات

شیدا بہ نسبت شاعری کے درباری تعلق کی وجہ سے زیادہ مشہور تھے چنانچہ 'تذکرہ فتوت'، 'گلزار آصفیہ' مولفہ خواجہ غلام حسین خاں ۱۲۶۰ھ۔ 'حدیقۃ العالم' مولفہ میر عالم اور 'اخبار نظام علی خاں' ان تمام تاریخی کتابوں اور تذکروں سے پتہ چلتا ہے کہ آصفجاہ ثانی نواب میر نظام علیخاں بہادر کے عہد سلطنت میں نوازش علی خاں شیدا خانسامانی یا بقول بعض میرسامانی کے ممتاز عہدہ پر فائز تھے۔ آصفجاہ ثانی نے جب اطراف واکناف کی شورشوں کو رفع کرنے کے بعد اورنگ آباد سے حیدرآباد کی طرف اپنا دارالسلطنت منتقل کیا اور یہاں کی قدیم عمارتوں کی ترمیم و نئے محلوں کی تیاری شروع ہوئی تو نوازش علی خاں شیدا زیادہ تر اس تعمیر و ترمیم کے نگراں کار رہے۔ چنانچہ گلزار آصفیہ میں

لکھا ہے کہ شیدا کے زیر اہتمام ایک محل تیار ہوا جس کا نام 'نوازش محل' رکھا گیا۔ یہ محل اب باقی نہیں رہا۔

تاریخ آصفجاہی مولفہ محمد بدیع الدین علی ۱۲۳۹ھ میں لکھا ہے کہ ۱۲۰۲ھ میں شیدا کی نگرانی میں حوض بنگلہ تیار ہوا جس کے صلہ میں جشن نوروز کے موقع پر آصفجاہ ثانی نے دوشالہ ملبوس خاص اور دستبند مرصع شیدا کو سرفراز فرمایا۔

اسی تلاش کے سلسلہ میں دفتر نظامت دیوانی مال سے ایک برآورد برآمد ہوئی ہے جو تیاری 'نظام ساگر' کے متعلق ہے۔ اور نظام علیخاں بہادر کے عہد میں داروغہ نعمت نواز خاں نے مرتب کی ہے۔ اس برآورد پر ایک مہر نوازش علی خاں بہادر کی ہے جس میں ۱۱۷۱ھ پڑھا جاتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نظام علیخاں بہادر کے تخت نشین ہونے کے قبل ہی سے شیدا عہدہ خانسامانی پر مامور تھے کیونکہ نظام علیخاں بہادر ۱۱۷۵ھ میں تخت نشین ہوئے ہیں۔

تاریخ آصف جاہی میں ایک اور جگہ لکھا ہے کہ سالگرہ کے موقع پر "نوازش علیخاں و قطب الدین خاں را بہ عطائے جیغہ و کنٹھی مالہ مروارید سرفراز ساختند" دوسری جگہ اسی کتاب میں لکھا ہے کہ ۱۲۰۴ھ کے سالگرہ کے دربار میں "مجاہد الدولہ و نوازش علیخاں را دو رقم بھجبند عطا فرمودند" ان بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۲۰۴ھ تک شیدا زندہ تھے۔ ان متذکرہ سنین اور واقعات کے لحاظ سے ہم اندازہ کر سکتے ہیں کہ نوازش علی خاں شیدا ۱۱۴۵ھ کے لگ بھگ پیدا ہوئے ہونگے اور ۱۲۱۰ھ کے قریب انتقال کیا۔ کیونکہ ۱۱۷۱ھ میں نظام ساگر کی برآورد پر جب ان کی مہر ہے اور یہ خانسامانی کے عہدہ پر فائز تھے تو اس وقت انکی عمر پچیس چھبیس سال سے کم نہ ہوگی اور ۱۲۰۴ھ تک جب وہ زندہ تھے تو ساٹھ پینسٹھ سال کی عمر میں انتقال کیا ہوگا۔

اخبار نظام علی خاں ایک فارسی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ نوازش علی خاں کے اکثر عرائض آصفجاہ ثانی کی نظر سے گزرتے تھے چنانچہ لکھا ہے کہ فتح زرمل کی خوشی میں شیدا نے نذر گذرانی تھی "عرضی مرسلہ نوازش علی خاں بہادر با ہفت روپیہ نیاز فتح قلعہ زرمل (۱۱۹۶ھ) از نظر مبارک گذشت" دوسری جگہ ایک اور عبارت اسی طرح کی ہے:۔ "غرہ محرم الحرام ۱۱۹۰ھ اول روز کسی یاد نہ فرمود۔ عرضی مرسلہ نوازش علیخاں بہادر از نظر انور گذشت"

ان عبارتوں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ۱۱۹۶ھ سے قبل شیدا کو 'خان بہادر' کا خطاب مل چکا تھا لیکن دفتر نظامت دیوانی و مال میں فہرست خطابات دیکھنے سے معلوم ہوا کہ آصفجاہ ثانی کے عہد میں نوازش علی نام کے تین آدمیوں کو

"خان بہادر" کا خطاب ملا ہے :۔

(۱) نوازش علی عرف محمد امین بیگ۔ خطاب خانی و بہادری و منصب سہ ہزاری عطا ہوا لیکن سند عطا کا داخلہ نہیں ہے۔

(۲) میر نوازش علی ولد میر عبداللہ۔ پانصدی منصب و خطاب خانی۔ ۹ ذیقعدہ ۳۳ سنہ شاہ عالم بدستخط نواب غفراں مآب۔ اسی سنہ میں ان کے بھائی میر نجف علیخاں کو بھی خطاب خانی و منصب عطا ہوا۔

(۳) میر نوازش علی اقربائے اعتصام الملک عباس علیخاں عرض بیگی۔ یکہزاری منصب و خطاب خانی و بہادری عطا ہوا، ۲ محرم ۴۷ سنہ بہادر شاہ ثانی۔

ان تینوں میں قرین قیاس یہ ہے کہ دوسرے نوازش علیخاں ہی شیدا مصنف روضۃ الاطہار ہیں۔ کیونکہ شیدا سید تھے اور سادات کے نام کے ساتھ اکثر میر لکھا جاتا تھا۔ دوسرے یہ کہ آصفجاہ ثانی کی دستخط سے خطاب و منصب عطا ہونا اس بات کی تصدیق ہے کہ یہ نوازش علیخاں شیدا خانسامان سرکاری ہی ہیں۔ پہلے نوازش علیخاں کا عرف بتا رہا ہے کہ وہ سادات سے نہیں تھے۔ اور نہ ان کے نام کے ساتھ "امیر" کا لفظ ہے۔ تیسرے صاحب اسی لئے شیدا قرار نہیں دئے جاسکتے کہ یہ بہت بعد کے آدمی ہیں۔ نظام علیخاں بہادر کے عہد سے انہیں کوئی واسطہ نہیں۔ اگر دوسرے نمبر کے نوازش علیخاں کو شیدا مان لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ شیدا میر عبداللہ کے فرزند تھے اور صرف خانی کے خطاب سے سرفراز تھے۔ حالانکہ "اخبار نظام علیخاں" کا مولف ان کو ۱۱۹۶ء ہی میں خان بہادر لکھتا ہے۔ بہرحال یہ امر مشتبہ ہے کہ انھیں خطاب کب اور کس سلسلہ میں عطا ہوا۔

۳۔ مذہبی خدمات

معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہی عاشور خانہ حیدرآباد سے شیدا کا تعلق عرصہ تک رہا اور اس کی ترقی میں انہوں نے کافی حصہ لیا اکثر تاریخی کتابوں میں عاشور خانہ مذکور کے ذکر کے سلسلہ میں شیدا کے کچھ نہ کچھ حالات ملتے ہیں۔ چنانچہ گلزار آصفیہ میں لکھا ہے کہ بادشاہی عاشور خانہ جسے محمد قلی قطب شاہ نے چھیاسٹھ ہزار کے صرفے سے تیار کیا تھا اور

اور عبد اللہ قطب شاہ نے اپنے عہد میں رنگ آمیزی اور آئینہ کاری سے زینت دی تھی اورنگ زیب کی فتح دکن کے بعد بالکل ویران کردیا گیا اور سرکاری گھوڑوں کا اصطبل بنادیا گیا تھا۔ آصفجاہ ثانی نواب میر نظام علیخاں بہادر کے عہد حکومت میں نوازش علیخاں بہادر شیدا کی سعی و کوشش سے سرکاری طور پر اس کی مرمت و درستی کی گئی اور بارہ ہزار روپیہ سالانہ اخراجات کے لئے مقرر ہوئے۔ شیدا کو اس عاشور خانہ کا منتظم بنایا گیا اور علم بھی استاد کئے جانے لگے۔ چنانچہ جب اس کی ترمیم ختم ہوئی تو شیدا نے اندرونی رواقوں اور صدر دروازہ کی تاریخیں کہیں جو ابتک اپنی اپنی جگہ کندہ کی ہوی موجود ہیں۔ رواقوں پر کی تاریخ:۔

(۱) "چون نظام الملک آصف منزلت | کردہ از بہر حسین توقیر او
ہست این قدسی مکان آن امام | کہ بفرقاں آمدہ تطہیر او
گفت ہاتف سال تاریخش چنین | کرد آصف جاہ ما تعمیر او"

۱۱۷۹ھ

(۲) "بہر احیائے طراز این مکان تدبیر کرد | در دل شرف اسد خالق چو این تاثیر کرد
عہد آصف جاہ ثانی آن شہ ملک دکن | لامکان جائے امام ما کہ او تعمیر کرد"

۱۱۷۹ھ

صدر دروازہ پر کی تاریخ یہ ہے:۔

"باب فیض امام عالمیان"

۱۱۷۹ھ

منتظم عاشور خانہ کی حیثیت سے شیدا نے عزاداری اور مرثیہ خوانی کو بہت فروغ دیا چنانچہ گلزار آصفیہ میں لکھا ہے کہ ارسطو جاہ کی رحلت تک (یعنی ۱۲۱۹ھ تک) مرثیہ خوانوں کی جماعتیں بڑے زور و شور سے تیار ہوتی تھیں چنانچہ سرکاری جماعتیں سترہ تھیں جن کے داروغہ پہلے نوازش علی خاں شیدا تھے ان کے بعد یہ عہدہ حکیم حمایت اللہ خاں کو ملا۔ یہ مرثیہ خوانوں کی جماعتیں یکے بعد دیگرے ایک خاص راگ میں مرثیے پڑھا کرتی تھیں۔ ان میں ایک پڑھنے والا

اور معتقد اس کے جوابی ہوتے تھے۔ اس قسم کی جماعتیں اب بھی حیدرآباد میں موجود ہیں اور اس قسم کی مرثیہ خوانی کو دنگل کہتے ہیں۔ حسینی علم اور شاہی عاشور خانے میں محرم میں اب تک دنگل ہوتے ہیں۔ عاشور خانہ شاہی کے انتظام کے علاوہ "نعل مبارک" کے علم کا انتظام بھی شیدا ہی کے سپرد تھا چنانچہ "صولت عثمانیہ" میں لکھا ہے کہ "جب محمد قلی قطب شاہ کے وقت حیدرآباد کی آبادی ہوئی تو وہ قلعہ سے اس علم (نعل صاحب) کو لاکے حیدرآباد میں اپنے محلسرا کی ایک جانب مکان میں رکھکر محرم میں استاد کرنے لگا۔ قطب شاہی حکومت تک وہ وہیں استاد ہوا کرتا تھا۔ میر نظام علیخاں بہادر کی عہد حکومت میں ارسطوجاہ مدارالمہام اور نوازش علیخاں متخلص شیدا کی سعی سے یہ علم چارکمان کی شمالی جانب جہاں ابتک موجود ہے ایک مکان میں رکھا گیا اور محرم میں یہیں استاد ہونے لگا۔"

جیسا کہ ہم نے اوپر بیان کیا ہے گلزار آصفیہ اور حدیقۃ العالم میں لکھا ہے کہ عاشور خانہ شاہی کے اخراجات کے لئے بارہ ہزار روپیہ سالانہ مقرر کئے گئے تھے لیکن اس زمانے کے اسناد جاگیر دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ صرف تین ہزار سات سو پچیس روپیہ کی جاگیر عطا ہوئی تھی جو ۱۲۱۵ف تک بحال رہی چنانچہ دو مختلف اسناد میں (جو اس وقت دفتر نظامت دیوانی و مال میں محفوظ ہیں) اس کا ذکر ہے:۔

(۱) پہلی سند میں لکھا ہے کہ ایکہزار چھ سو روپیہ اخراجات عاشور خانہ بادشاہی مقرر کئے گئے اور یہ عہد نوازش علیخاں بہادر تفویض کیا گیا (سنہ عطا کا داخلہ نہیں ہے)۔

(۲) دوسری سند ۱۱۹۱ھ کی ہے جس میں لکھا ہے کہ دو ہزار ایک سو پچاس روپیہ بجہت اخراجات عاشور خانہ عطا کئے گئے۔

منتظمی عاشور خانہ کا عہدہ ابتک ان کے ورثا میں چلا آرہا ہے لیکن جاگیرات بحال نہیں ہیں۔ چنانچہ موجودہ منتظم عاشور خانہ میر محمد علی صاحب شفیق ہیں جو شیدا کو اپنا جد اعلیٰ بتاتے ہیں۔

۴۔ تصانیف

روضۃ الاطہار۔ یہ مشہور کتاب بارہ مجلسوں پر مشتمل ہے جن کے موضوع پنجتن پاک اور شہدائے کربلا کے

حالات ہیں۔ اس کا سنہ تصنیف ۱۱۰۳ ہجری ہے اسکے اکثر نسخے مختلف خانگی کتب خانوں میں ملتے ہیں سب سے قدیم نسخہ جس کا سنہ تصنیف اور سنہ کتابت ایک ہے عالیجناب نواب سالار جنگ بہادر کے کتب خانے میں موجود ہے۔ اس کتاب کی تیاری میں تین ماہ بیس یوم صرف ہوئے جس کا اظہار مصنف نے اس طرح کیا ہے۔

"اگر ایام تیاری کے چاہو عدد نام 'علی' کے کر نکالو"

اشعار کی تعداد ( ) ہے اور تاریخ تصنیف بھی خود مصنف ہی نے اس طرح کہی ہے :۔

ہوا جب ختم یہ مضمون ماتم کہا تاریخ ہاتف 'مجلس غم'
(۱۱۰۳ھ)

کیا جا ہو تم آسانی سیں از بر ایگیارہ سو پہ سن تھا تب نہتر

اس قسم کی متعدد کتابیں اس سے پہلے بھی لکھی گئیں لیکن ان میں بالعموم دس فصلیں ہوتیں اور ان کے نام "دہ مجلس" ہوا کرتے تھے۔ کیونکہ یہ کتابیں صرف محرم کے ابتدائی دس دن میں پڑھنے کے لئے لکھی جاتی تھیں۔ "روضۃ الاطہار" بھی اسی صنف کی کتاب ہے مگر اس کو اس قسم کی جملہ کتابوں میں خاص امتیاز حاصل ہے۔ اس کی خصوصیتیں حسب ذیل ہیں :۔

پہلی خصوصیت

"روضۃ الاطہار" ولی اور فضلی وغیرہ کی دہ مجلسوں کی طرح کسی فارسی کتاب کا ترجمہ نہیں ہے بلکہ نوازش علی خاں شیدا کی ذاتی تصنیف ہے جس کا اظہار مصنف نے کتاب کے دیباچہ میں اس طرح کیا ہے :۔

ہوا یکدن مجھے الہام از غیب کہ توں حسنین کا شیدا ہے لاریب
پڑا نج مرثیوں کا جگ میں ہی دھوم محباں کے گلا یا دل کوں جیوں موم
کتاب یک توں بنا ہندی زباں سوں انکھیاں عالم کی کرانجواں سیں جیوں
کمر میں اس سعادت پر بندھا تب کتابوں کو منگا تاریخ کی سب

لکھا احوال سارا بے کم و کاست مدد حسنین سیتی کر کے درخواست

اس لحاظ سے 'روضۃ الاطہار' کی اہمیت دوسری 'دہ مجلسوں' کے مقابلہ میں بہت بڑھ جاتی ہے۔

دوسری خصوصیت

مصنف کے معلومات کا ماخذ تاریخی کتب ہونے کی وجہ سے انہوں نے صرف حالات شہادت ہی پر اکتفا نہیں کی ہے بلکہ پنجتن پاک علیہم السلام کی ولادت کے واقعات کے ساتھ ساتھ کہیں کہیں معجزے اور روایتیں بھی نظم کی ہیں اور دو مجلسوں کا اضافہ بھی کیا ہے۔ اب یہ محض محرم میں پڑھنے کے لئے نہیں رہی بلکہ اس میں ایک عام دلچسپی پیدا ہوگئی ہے جو اسے صرف فرقۂ امامیہ تک محدود نہیں رکھتی۔

تیسری خصوصیت

اس سلسلہ کی کتابوں میں جو 'دہ مجالس' کہلاتی تھیں اور عموماً مثنوی کی بحر میں لکھی جاتی تھیں 'روضۃ الاطہار' آخری کتاب ہے۔ اسکے بعد مجالس کی منظوم کتابیں شاید ہی لکھی گئی ہوں کیونکہ مرثیوں کا رواج بڑھتا جا رہا تھا جن کی شکلیں۔ مربع۔ مسدس۔ یا مخمس پر مشتمل ہوتی تھیں۔ اسکے علاوہ نوازش علیخاں شیدا (جو آصفجاہی عہد کے ابتدائی زمانے کے شاعر ہیں) کے بعد کچھ عرصے تک دکن میں مرثیہ گوئی و مرثیہ خوانی کا زور کم ہو گیا تھا۔ مرثیہ گوئی کی طرف بہت کم شعرا کا رجحان رہا۔ اس لحاظ سے بھی یہ کتاب اہمیت رکھتی ہے۔

چوتھی خصوصیت

لسانی خصوصیت کے لحاظ سے بھی یہ زبان دکن کی آخری کتابوں میں سے ہے۔ کیونکہ اس کتاب کی تصنیف کا وہ زمانہ ہے جب کہ دکن میں شمال سے شاعروں کی آمد و رفت شروع ہوگئی اور یہاں کی تحریری زبان شمالی اثر کے تحت بدلنے لگی۔ دکنی خصوصیتیں رفتہ رفتہ کم ہونے لگیں اور فارسیت کا عنصر بڑھنے لگا۔

اس حیثیت سے جب تاریخ ادبیات اُردو کے مورخ یہ معلوم کرنا چاہیں گے کہ دکن کی علمی زبان اپنے زوال کے زمانے میں کس قسم کی تھی اور کن خصوصیات کی حامل تھی تو انھیں اس کتاب (روضتہ الاطہار) کا ضرور ہی مطالعہ کرنا پڑیگا یہ کتاب دکن کے تین سو سالہ عظیم الشان اردو ادب کی آخری کڑی ہے اور جب دکنی اردو کے قدیم ترین کارنامے مثلاً "نظام نامہ" "رسائل شاہ برہان" "قطب مشتری" "کلیات محمد قلی قطب شاہ" وغیرہ پر اردو کے بڑے بڑے محققین تحقیقات کر رہے ہیں اور ان قدیم ادبی شاہ کاروں کو موجودہ ادبی دنیا سے روشناس کرا رہے ہیں تو ضروری ہے زبان کے تقابلی مطالعہ کے لئے اس سلسلہ کی آخری کتاب پر بھی نظر ڈالی جائے ۔ روضتہ الاطہار کی یہ خصوصیت نہایت اہم ہے ۔

اعجاز احمدی ۔ یہ ایک طویل اردو مثنوی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سوانح حیات پر مشتمل ہے ۔ روضتہ الاطہار سے اس کا حجم زیادہ ہے اور اس کے چودہ سال بعد لکھی گئی ہے ۔ جامعہ عثمانیہ کے کتب خانہ میں ہمیں اس کا ایک نسخہ دستیاب ہوا لیکن اس نسخہ کے ابتدائی اوراق نہیں ہیں ۔ کتب خانہ آصفیہ میں بھی اعجاز احمدی کا ایک قلمی نسخہ موجود ہے جس کے خاتمہ پر "جلد دوم" لکھا ہوا ہے حالانکہ یہ جلد صرف آنحضرت کی مکہ سے ہجرت تک واقعات پر مبنی ہے ۔ کتب خانہ جامعہ عثمانیہ کا نسخہ ہجرت کے بعد کے حالات سے شروع ہو کر آنحضرت کی وفات پر ختم ہوتا ہے ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شیدا نے دراصل اس کتاب کو کئی حصوں میں تقسیم کیا تھا کیونکہ کتب خانہ آصفیہ کے نسخہ کے آخر میں ان کے تخلص اور خاتمہ کا شعر بھی ہے اور "تمام شد جلد دوم اعجاز احمدی" لکھا ہوا ہے ۔

اے شیدا قلم پر ہے یہ اضطراب		کہ منزل کون مقصد کے پہنچے شتاب
بھلا ہے تون کراوسکی مطلب کا کام		کروڑون مین کہنا نبی پر سلام

یہ نسخہ بھی ناقص الاول ہے لیکن آخر میں چند ابتدائی اوراق شامل ہیں ۔ حمد کے بعد نعت میں بھی ایک شعر انکے تخلص کا ملتا ہے :-

اے شیدا تجھے یہ قیافہ کہاں		کرے نعت ختم النبی کا بیاں

نعت کے بعد کتاب کی وجہ تصنیف تمہید میں اس طرح بیان کی ہے :-

کہ اے نخل بند ریاض سخن | ترے شعر کا دہوم ہے چوکدھن
بہت نعت کے تون قصائد کہا | معطر دماغ سخن کوں رکھا
تون کر مثنوی معجزوں کی تمام | رکھا گلشن ایمان کر اوسکا نام
جناب رسالت کا سب ماجرا | سبا میں مفصل گیا ہے لکھا
عربی ہے یا فارسی کا کلام | سمجھہ اوسکون سکتے نہیں ہیں عوام
تو ہندی زباں میں لکھیگا اگر | سبھی پڑھ اسے ہوینگے بہرہ ور
کیا اس میں کوئی نہیں اپنا فکر | کہ یہ فکر ہے فی الحقیقت ذکر
یہ دولت تھی قسمت میں میرے لکھی | سمجھہ عین افضال حق ہے یہی
منگا کر سیر کی وہیں سب کتاب | روایات اصحہ کون کر انتخاب
لکھا ابتدا سین میں تا انتہا | نہونے دیا فوت کوئی مدعا
یہ اعجاز ہے احمدی سر بسر | کیا میں نے موسوم اس نام پر
ہے بحر تقارب میں یہ مثنوی | ملے قرب قاری کتیں معنوی
ہے مصرع ہر یک اسکا سرو عدن | تر و تازہ سر سبز رشک چمن
ہر یک بیت جیوں بیت فردوس ہے | نہ سمجھے اگر کوئی تو افسوس ہے
ہے اعجاز خیر البشر یہ تمام | وگرنہ میں کیا اور میرا کلام

جامعہ عثمانیہ کے نسخہ میں مثنوی کے ختم پر تخلص کا شعر اور چند دعائیہ اشعار حسب ذیل ہیں :-

اے رشیدا ہے مضمون یہ دردناک | کیا صبر اپنے گریباں کون چاک
کہاں تاب لاویگے سن مومناں | بھلا ہے تون کر ختم رونا یہاں
الٰہی بحق رسول کریم | دے سامع کتیں اسکی اجر عظیم
قیامت کا ہے روز وہ پر نہیب | کر ہم عاصیوں کون شفاعت نصیب

مجھان کرا ول انجھو سیں وضو — کہ جس سین ملے حشر میں آبرو
کروڑوں درود اور کروڑوں سلام — وہ روح مقدس پہ بھیجو مدام

اعجاز احمدی کی زبان بہ نسبت روضتہ الاظہار کے زیادہ صاف ہے اور اسلوب میں روانی معلوم ہوتی ہے ہم یہاں اعجاز احمدی کے چند اشعار کا اقتباس پیش کرتے ہیں جن سے اسکے طرز بیان اور زبان کا اندازہ بخوبی ہوسکتا ہے جنگ بدر کا واقعہ اس طرح بیان کرتے ہیں :-

اے ساقی مجھے دے توں جام ہلال — کہ ہے بدر کی جنگ کا اب خیال
نہ وہ جام جس سیتی ہووے خمار — کرے بلکہ اسرار کا راز دار
قلم کا یہ میری ہلالی تراش — اوسے بدر کی فتح کا ہے تلاش
سنو اے مجھان نصرت شعار — ہوا بدر کا کس طرح کارزار
کہ پہنچی نبی کون خبر ناگہاں — کہ نکلا ہے کعبہ سین یک کارواں
گراں جنس ہے سات اونکے تمام — وہ چہتی ہیں جانے کے تئیں ملک شام
بوسفیان ہے اس کارواں میں امیر — ہوئے ہیں رفیق اُسکے کئی یک شریر
سنے یہ خبر جب حبیب الٰہ — کئے حکم تیار ہووے سپاہ
صحابی ہو مستعد آئے تبہی — چلے آپ تشریف لیکر نبی
بوسفیان کون پہنچی ہے جاکر خبر — کہ لیکر صحابیوں کون خیر البشر
کمر باندھ کر کینہ خواہی پہ تنگ — نکل آئے ہیں شہر سیں بہر جنگ
یہ سنتے ہی سفیان ہوا خوفناک — ٹا ہوش کے سبب پر لیکے خاک

گلشن ایمان ۔ اعجاز احمدی کے دیباچے میں (جس کے چند اشعار ہم نے اوپر نقل کئے ہیں) آپ نے لکھتے ہیں کہ انھوں نے "قصائد نعتیہ" کے علاوہ آنحضرت اور آئمہ علیہم السلام کے معجزات جمع کرکے مثنوی کی شکل میں نظم کئے تھے جس کا نام گلشن ایمان رکھا تھا۔ لیکن نہ تو "قصائد نعتیہ" کا مجموعہ ہی اب تک دستیاب ہوا اور نہ

"گلشن ایمان" کا نسخہ کسی کتب خانہ میں پتہ چلا۔ شیدا کے تمام تصانیف میں صرف روضتہ الاطہار ہی ایک ایسی کتاب ہے جس کے اکثر نسخے مختلف کتب خانوں میں ملتے ہیں اور یہ خود اس کے مقبول خاص و عام ہونے کی دلیل ہے۔

جامع الفوائد۔ کتب خانہ دفتر دیوانی و مال حیدرآباد میں ایک قلمی نسخہ دستیاب ہوا جس کا نام جامع الفوائد ہے اور اسکے مولف شیدا ہیں۔ یہ فارسی نثر میں ہے جس کی تمہید میں شیدا نے وجہ تالیف یوں بیان کی ہے:۔

"اما بعد مولف این رسالہ و محرر این مقالہ اضعف من عباد اللہ میر نوازش علیخان شیدا معروض خدمت صاحبان سخن می سازد کہ جمعی از دوستان وارد کلبہ مسکین گشتند۔ چندی اختلاط و دوستانہ گرم داشتہ بعد انعقاد طول مصاحبت بسر رشتہ سخن بانیجا رسانیدند کہ قواعد فارسی کہ متکلمان را دانستن آن واجب است تمام و کمال در یک کتاب یافتہ نمی شود۔ باید کہ نسخہ جامعہ در این باب تالیف سازی کہ بر صحیفہ روزگار یادگار بماند۔ چون اصرار دوستان یکی از ہزار شد ناچار بعروۃ الوثقائے افضال ایزدی متمسک گردیدہ فرہنگ شرفنامہ و جہانگیری دموید الفضلا و برہان قاطع و مدار الافاضل و دستور العمل و مفتاح الفرس و شرح مثنوی و شرح خاقانی و انوری وغیرہ کتب فراہم آوردہ از ہر خرمن خوشہ و از ہر مائدہ توشہ برداشتہ بر یک مقدمہ و سہ قانون و یک خاتمہ ترتیب دادہ بہ "جامع الفوائد" موسوم ساختہ۔"

اس مختصر رسالہ سے ہم یہاں چند سطور بطور نمونہ نقل کرتے ہیں تاکہ شیدا کی فارسی قابلیت کا بھی اندازہ ہو سکے:۔

قانون سوم۔ در بیان قواعد جلیلہ و فوائد جمیلہ۔ **قاعدہ**۔ بدانکہ حروف و کلمات ضمائر شش است سہ ازان مفرد ساکن و آن شین و تائے قرشت و میم است کہ در آخر کلمات ترکیب یابند جہت حصول معانی مختلفہ۔ شین برائے واحد غائب۔ تا برائے واحد حاضر۔ میم برائے متکلم۔ و سہ مرکب و آن ند و ید و یم۔ ند برائے تثنیہ و جمع غائب و ید برائے تثنیہ و جمع متکلم اگرچہ ند و ید کلمات ضمائر تثنیہ و جمع اند اما گاہے برائے تعظیم بر اسم مفرد ہم می آرند وہم چنین ضمائر منفصل نیز شش است۔ سہ برائے مفرد چون او۔ تو۔ و۔ من۔ او برائے مفرد غائب۔ تو برائے مفرد مخاطب حاضر۔ من برائے متکلم۔ و سہ برائے غیر مفرد چون ایشان و شما و ما۔ ایشان برائے تثنیہ و جمع غائب۔ شما برائے تثنیہ و جمع حاضر۔ ما

برائے متکلم و تثنیہ ۔ **قاعدہ** ۔ باید دانست کہ شین در آخر اسما ضمیر غائب دہد و معنی او باشد چون اسپش ۔ غلامش یعنے اسپ او و غلام او ۔ و در آخر افعال معنی او را باشد چون زدش و گفتنش یعنے زد او را و گفت او را ۔"

جامع الفوائد کے خاتمہ پر شیدا نے خود ہی تاریخ تصنیف کہی ہے :۔

"ونسخہ بیاسمہ فارسی چہاردہم ماہ رجب المرجب ۱۲۰۳ھ روز چہارشنبہ دو گھڑی پاس و چار گھڑی روز برآمدہ بود کہ با نیکو زمان باتمام رسید و ازین ہر چہار فقرہ علیحدہ علیحدہ ساز و سال تاریخ بر می آید ۔ نظم :۔

بیا شیدا کہ اتمام کتاب است سخن را از اطالب اجتناب است

ہمان بہ ختم کن برنام باری کہ یابی مقصد دل ہر چہ داری

الٰہی رحم کن برحال زارم کہ غیر از تو کسی دیگر ندارم

سراپا گرچہ گشتم شکل عصیان چہ غم دارم چو تو غفار و رحمان

رسان دائم ز من صلواۃ بیحد بروح اقدس حضرت محمدؐ

اسکے علاوہ ممکن ہے کہ غزلیں اور مرثیے وغیرہ بھی شیدا نے لکھے ہوں لیکن اب تک ان کا پتہ ہمیں نہیں ملا ممکن ہے کہ آگے چلکر کسی کو دستیاب ہو جائیں ۔ البتہ غزل کے چند شعر دستیاب ہوے تھے جو اس حصہ کے شروع میں مندرج کردیے گئے ہیں ۔ ان کے ورثار کا بیان ہے کہ طغیانی رود موسیٰ میں شیدا کے متفرق کلام کا تمام ذخیرہ نذر سیلاب ہو گیا ۔

معلوم ہوتا ہے کہ نوازش علیخاں شیدا علم نجوم سے بھی اچھی طرح واقف تھے ۔ ہمارے اس بیان کی تصدیق تزک آصفیہ کے صفحہ (۴۹۹) کی حسب ذیل عبارت سے ہو سکتی ہے :۔

" روز غرہ رجب المرجب درمیدان باغ گوردہنداس خیمہ نصرت اساس استادہ شد ۔ خود جوان نیر تابان بدولت و اقبال بعد انقضائی وقت زوال بایمائی انجم شناسان اہل کمال خصوصاً نوازش علیخاں بہادر کہ جامع کمالات محصوری و معنویست سوار شدہ داخل خیام فلک احتشام شدند ۔

نظم طباطبائی

اور

انکی شاعری

از:۔ نور اللہ محمد نوری (عثمانیہ)

نواب حیدر یار جنگ سید علی حیدر نظم طباطبائی لکھنو میں ۱۶ محرم ۱۲۷۱ھ م ۱۵ اکتوبر ۱۸۵۴ء بمقام حیدر گنج قدیم پیدا ہوئے ان کا سلسلۂ نسب اسمٰعیل بن ابراہیم بن حسن بن علی بن ابی طالب تک پہنچتا ہے جن کا لقب طبا طبا تھا۔ اس لقب کی وجہ یہ ہے کہ اسمٰعیل بچپن میں زیادہ تتلاتے تھے اور اکثر الفاظ کا تلفظ ط سے ادا کرتے تھے۔ ایک وقت عید کی تیاری کے زمانے میں اسمٰعیل سے ان کے باپ نے دریافت کیا کہ تمہارے لئے کونسا لباس تیار کرایا جائے تو انھوں نے جواب دیا طبا طبا یعنی قبا قبا اُس روز سے ان کا لقب طبا طبا ہو گیا۔ ان کے والد میر مصطفےٰ حسین جلال آباد کے فوجدار تھے ان کا یہ شعر مستزاد سیر المتاخرین میں درج ہے ؎

ہم نے اب تک تو ترا عشق نباہا آہا کھاکے سو طرح کے غم
حیف پر تو نے کسی طرح نہ چاہا آہا بانی جور و ستم

میر مصطفےٰ حسین کی والدہ ذکیہ بیگم آصف الدولہ بہادر والی اودھ کے وزیر نواب مختار الدولہ بہادر

کی حقیقی پوتی تھیں۔

علامہ مرحوم نے سولہ سترہ برس کی عمر تک لکھنو ہی میں تعلیم و تربیت حاصل کی۔ عربی علم ادب ملا طاہر نحوی سے فارسی اور علم عروض منشی پنڈت ولال راز سے اور منطق و فلسفہ کی تعلیم محمد علی صاحب قائم الدین سے حاصل کی لکھنو سے والد کے ہمراہ مٹیا برج کلکتہ تشریف لائے۔ تبدیل مقام کی وجہ سے ان کے مذاق خیالات وضع قطع اور زبان میں کوئی فرق نہیں آنے پایا' کیونکہ یہ چھوٹی سی آبادی جو کلکتہ سے تھوڑے فاصلے پر آباد تھی۔ واجد علیشاہ معزول تاجدار اودھ کی بدولت لکھنو کا ایک ٹکڑا معلوم ہوتی تھی۔ اس آبادی کے تمام باشندے لکھنو ہی کے رہنے والے تھے جو اپنے بادشاہ کی رفاقت میں یہاں آبسے تھے۔ بادشاہ کے مصاحبوں میں ہر قسم کے اہل علم جمع تھے اور لکھنو سے یہ شعرا بھی بادشاہ کے ہمراہ آئے تھے۔ مشفق۔ قاسم رخشاں۔ ہنر۔ عیش۔ بہار۔ مائل۔ شرف۔ طوبیٰ۔ یاور۔ بادشاہ نے ان میں سے سات کو سبعہ سیارہ کے لقب سے نامزد کیا تھا طباطبائی مرحوم نے اس صحبت سے خاطر خواہ فائدہ اٹھایا اور یہاں بھی اپنے سلسلہ تعلیم کو جاری رکھا اور مطالعہ کتب سے اپنے علمی استعداد میں اضافہ کرتے رہے' اس اثناء میں وہ لکھنو بھی کئی مرتبہ تشریف لے گئے اور جب بادشاہ نے مٹیا برج میں شہزادوں کی تعلیم کے لئے ایک مدرسہ قائم کیا تو طباطبائی مرحوم عربی پڑھانے پر مامور ہوئے ۱۸۸۱ء میں واجد علیشاہ کے انتقال کے ساتھ یہ مدرسہ بھی ٹوٹ گیا۔ اور وہ حیدرآباد دکن چلے آئے۔ یہاں ان کو میر افضل حسین سابق میر مجلس عدالت عالیہ نے اپنے فرزند آقا سید حسن کی اتالیقی پر مامور کیا اور پھر وہ کچھ دنوں بعد نواب عماد الملک بہادر کے حکم سے کتب خانہ آصفیہ کی مہتممی پر فائز ہوئے۔ اس کے بعد نظام کالج میں عربی کے تیس سال تک پروفیسر رہے پھر اعلیحضرت بندگان عالی نے شہزادگان والاشان کی اتالیقی پر مقرر فرمایا۔ اور چار سال تک اس خدمت کو انجام دیا۔ اس کے بعد آٹھ سال تک دارالترجمہ میں ناظر ادبی رہے اس کے بعد وظیفہ پر علیحدہ ہو گئے لیکن دارالترجمہ کی وضع اصطلاحات کی کمیٹیوں میں آپ کو برابر مدعو کیا جاتا تھا۔ اور تاریخ میں بیرونی کے واقعہ کی طرح شاید یہ واقعہ یادگار رہے کہ علم کے اس بحر ذخار نے اپنے مرنے کے ایک دن پہلے بھی کمیٹی میں

شرکت کی اور اپنے ملک کی اور اپنی مادری زبان کی خدمت انجام دی ۔

ان خدمتوں کے سلسلے میں شاید یہ ذکر بے محل نہ ہوگا کہ جب لارڈ کرزن نے یہ قانون نافذ کیا کہ ہر صوبے کے مدارس کا تعلق اسی صوبے کی یونیورسٹی سے ہوگا تو طباطبائی مرحوم اور ڈاکٹر اگھورناتھ کی کوشش سے حیدرآباد میں عالم و فاضل کے امتحانات قائم ہوئے ورنہ اس سے بیشتر دارالعلوم کے طلبا کو امتحان کے لئے پنجاب جانا پڑتا تھا ۔ اور ان ہی کی کوشش سے مدراس یونیورسٹی میں بھی افضل العلما و فاضل کے امتحانات قایم ہوئے ۔

طباطبائی مرحوم کی تصانیف نہ صرف اردو ہی میں ہیں بلکہ عربی میں بھی وہ کئی کتابوں کے مصنف ہیں جو ان کی قابلیت اور معلومات کی بین دلیل ہیں، وہ جس طرح مشرقی علوم کے ماہر تھے اسی طرح مغربی علوم سے واقف تھے اور فن شعر کے محقق تھے ۔ اردو میں ان کی تصنیفات شرح دیوان غالب ۔ تلخیص عروض و قافیہ ۔ ترجمہ تاریخ طبری جلد دوم اور عبدالماجد اور قاضی تلمذ حسین کی شراکت میں تاریخ یورپ کے ایک حصے کا ترجمہ نظم طباطبائی حصۂ اول دیوان طباطبائی شایع ہو چکے ہیں اور غیر مطبوعہ کتابوں میں نظم طباطبائی حصۂ دوم اور شرح دیوان امرء القیس ہے جس کا کچھ حصہ رسالہ مشاعرہ میں شایع ہو چکا ہے اور علمی و ادبی مضامین ہیں جو مختلف رسالوں میں شایع ہو کر خراج تحسین حاصل کر چکے ہیں ۔ اگر یہ مضامین اور مندرجہ بالا کتابیں شایع ہو جائیں تو اردو ادب میں ایک گرانقدر اضافہ ہوگا ۔

عربی میں ان کی تصنیفات بینات، معربات ۔ تعریب الاطفال ۔ تشریح الافلاک ہیں ۔

مولانا کے شاگردوں کا حلقہ بہت وسیع تھا ۔ مختلف علوم و فنون میں آپ کے آگے طلبا نے زانوے شاگردی تہ کیا ہے ۔ آپ کے مشہور شاگردوں میں پنڈت رتن ناتھ سرشار، عبدالحلیم شرر ۔ غلام مصطفےٰ ذہین ۔ حکیم میر نوازش علی لمعہ، میر شایق حسین سفیر تو اس جہان سے گزر چکے اور جو موجود ہیں اُن کے نام یہ ہیں :۔ ہز اکسلینسی مہاراجہ سرکشن پرشاد صدراعظم باب حکومت سرکار عالی سید مہدی صاحب معتمد باب حکومت، نواب شہید یار جنگ بہادر نواب کمال یار جنگ ۔ حکیم محمد عابد صاحب ۔

ان کا انتقال محلہ ملاپلی میں ۱۷ محرم ۱۳۵۲ھ م ۱۸ تیر ۱۳۴۲ف صبح کو کھانسی کی شدت میں قلب کی حرکت بند ہو جانے سے ہو گیا۔ خدا ان کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔

کلام پر تبصرہ

لکھنو اور مٹیا برج کی صحبتوں نے شاعری کا لگاؤ طباطبائی مرحوم کی طبیعت میں پیدا کر دیا۔ اُن کا مطالعہ نہایت وسیع تھا۔ اور فن شعر کی عمدہ عمدہ کتابیں خصوصاً ابن رشیق کی کتاب العمدہ انکی نظر سے کئی بار گزری تھی جس کا ثبوت ان حوالوں سے ہو سکتا ہے جو انھوں نے شرح دیوان غالب اور اپنے مضمون ادب الکاتب میں پیش کئے ہیں۔ متقدمین شعرائے عرب کے کلام کا انھوں نے نہایت غائر نظر سے مطالعہ کیا تھا۔ ان کا ارادہ عربی زبان کے شعر و سخن کے شاہکاروں کو اردو میں منتقل کرنے کا تھا۔ تاکہ اردو ادب میں اضافہ ہو اور ہمارے شعرا کے لئے ایک مثال قائم ہو۔ اِسی کوشش میں انھوں نے امرء القیس کے دیوان کی شرح لکھی تھی اپنے کلام میں بھی انھوں نے جہاں تک ہو سکا ہے کلام عرب سے فائدہ اٹھایا ہے وہ عربی جملوں اور الفاظ کا نہایت کثرت سے استعمال کرتے ہیں۔ انھوں نے جو قصائد لکھے ہیں اس میں بھی شعرائے عرب کی پیروی کی ہے غزل میں وہ شعرائے لکھنو کی طرح معشوق کے سراپا کنگھی چوٹی وغیرہ کا کثرت سے ذکر نہیں کرتے مضامین زیادہ تر پند و نصائح اور عاشقانہ رنگ کے ہوتے ہیں۔ نظم میں بھی جدت پائی جاتی ہے۔

غزل

دیوان میں اردو غزلیں فارسی غزلوں کے ساتھ ساتھ ہیں تقریباً تمام غزلیں یا تو کسی کی فرمایش پر لکھی گئی ہیں یا مشاعرہ کی خاطر یا گلدستوں کی طرحوں کے لئے۔ بقول ان کے انھوں نے خود سے کوئی غزل نہیں لکھی۔ دیوان کی بھرتی کے لئے ردیفیں بھی پوری نہیں کی گئیں۔ چنانچہ ٹ۔ ث۔ ج۔ ڈ۔ ڑ۔ ز۔ س۔ ص۔ ط۔ ظ۔ ع۔ غ۔ ک۔ گ۔ ل کی ردیف میں کوئی غزل نہیں پائی جاتی۔ اور نہ کوئی غزل بے ردیف کی ہے۔ سنگلاخ زمینوں میں ایک غزل بھی نہیں۔ اکثر

غزلوں پر ان کے اوزان لکھے گئے ہیں۔ لیکن ان میں بھی جدت طرازی ہے۔ مثلاً اس غزل کی تقطیع

ہے تل کو یہ منظور کہ چھپ جائے نظر سے	گیسو کا ارادہ ہے کہ بڑھ جائے کمر سے

عام عروضی اس طرح کرتے ہیں۔ مفعول مفاعیل مفاعیل فعولن اور اس کو بحر مضارع میں شامل کرتے ہیں۔ لیکن مولانا نے اس کی تقطیع فاعیل مفاعیل مفاعیل مفاعیل سے کی ہے۔ لیکن یہ نہیں بتایا کہ اس کا نام کیا ہے اور تقطیع میں ' ل ' کیوں زیادہ کیا گیا ہے۔ اسی طرح :

خبر ہوئی خود بخود یہ دل کو کہ دہر دار الامال نہیں ہے
خوشی یہ کہہ کر ہوئی روانہ مراٹھکانہ یہاں نہیں ہے

اس کی تقطیع عموماً چار فعول فعلن سے کی جاتی ہے لیکن مولانا نے اس کا وزن مفاعلن فاعلن فعولن بتایا ہے۔

آفریں شوق گام فرسا پر گر کے اٹھا ہوں میں ہر اک حبا پر

کی تقطیع فاعلاتن مفاعلن فعلات بتائی گئی ہے۔ یہاں بھی تقطیع میں ت زیادہ کیا گیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ مولانا فن عروض میں کوئی اضافہ کرنا چاہتے تھے چونکہ یہ مضمون یعنی فن عروض میں مولانا کی اصلاحات خود ایک تفصیل کی محتاج ہیں اس لئے اس کو یہاں ختم کر دیا جاتا ہے۔

غزل کی زبان

مولانا طباطبائی کی زبان خاص لکھنو کی صاف اور شستہ ہے چونکہ عربی کا اثر ان پر غالب ہے اس لئے وہ اردو میں عربی کے ایسے محاورے اور الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ جو عام فہم نہیں ہوتے بلکہ ان کی تشریح کی ضرورت ہوتی ہے مثال کے طور پر خط کشیدہ الفاظ ملاحظہ ہوں۔

ترے جلوے کے آگے اپنی ہستی کو فنا پایا	یہ پیغام اجل ہم نے دم قالو بلی پایا
رگ گردن سے اقرب آسماں سے ماورا پایا	نہ پہچانا کبھی ہم نے اسے اور بارہا پایا
سنیں اس بدزباں سے ہیں لبنے باتیں مجھ سے ناصح نے	ہوا یہ سلسلہ اپنی احادیث معقن کا

حباب اٹھ کر قرار بحر سے تا سطح آب آیا ۔ اُبھرنے والے جو ہیں ناتواں ہو کر اُبھرتے ہیں

جنوں تمکیں سے بہتر ہے کہ ہرگز ہو نہیں سکتا ۔ تغیر آب راکد کی طرح سے آب جاری میں

آ کے میخانے میں جو عزلت گزیں ہو جائے گا

دور گر دوں اس کو دور سا نگیں ہو جائے گا

اسی طرح وہ ایک شعر میں شتر کے بجائے جمل کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ اور غزل میں جمل کے لفظ کی غرابت ظاہر ہے بعض وقت غزل میں کسی علمی مسئلے کا بیان کرتے ہیں یا کوئی تلمیح لے آتے ہیں جس سے شعر کو سامع فوراً سمجھ لیتا ہے۔ مثلاً

لے چلی تخت رواں سے خاک مدفن میں قضا ۔ دیدۂ مور اب سلیماں کا نگیں ہو جائیگا

شیخ کو جھک ہے کہ سمجھائے مجھے شکل عروس ۔ ذہن میں لاؤں کہاں سے باقر داماد کا

رہینگے صورت عیسیٰ نہ راہ ہستی میں ۔ پیادہ ہو کے نکل جائینگے سوار سے ہم

ہے وہی علت عدم کی ہے جو علت کا عدم ۔ باعث ہنگامہ اپنی ناشناسائی ہوئی

تو ستایش گر ہے جس کا وہ ہے تیرا مدح خواں

یہ تو اے شفق ضمیر مرحبا اُلٹی پھری

محاورات مولانا کو اہل لکھنو کی طرح محاورات کو نظم کر دینے کا نہایت شوق ہے۔ قافیہ سے ان کا خیال فوراً محاورے کی طرف جاتا ہے۔ اکثر غزلوں سے اس کی تصدیق ہو سکتی ہے۔ مثال کے طور پر ہم صرف دو غزلوں کے محاورے درج کرتے ہیں۔

ایک غزل کا مطلع یہ ہے:

کہے سنے سے ذرا پاس آ کے بیٹھ گئے ۔ نگاہ پھیر کے تیوری چڑھا کے بیٹھ گئے

مولانا نے اکثر جگہ اس خیال کا اعادہ کیا ہے کہ اردو شاعر کو مضمون قافیہ اور ردیف سے ملتا ہے محمل کا قافیہ شاعر کو نجد کی طرف لیجاتا ہے تو بسمل کا مقتل کی طرف کھینچتا ہے۔ اسی طرح اس غزل میں بیٹھنے سے

ملاکر جس قدر محاورے ہو سکتے تھے ۔ مولانا نے ان سے ایک ایک شعر بنا لیا ۔ مثلاً دل بیٹھنا ۔ سکہ بیٹھنا پہرے بیٹھنا ۔ پیڑی جما کے بیٹھنا ۔ گھر میں بیٹھنا ۔ گردن جھکا کے بیٹھنا ۔ اس غزل کا مقطع ہے :

وہ اب کہاں ہے جو پہلے تھا نظم پر عالم
کہ سر پہ بار مصائب اٹھا کے بیٹھ گئے

یہاں بھی بیٹھ گئے خراب و خستہ ہونے کے معنوں میں خاص محاورہ ہے ۔

ایک اور غزل یہ ہے :۔

میں ہوں بندوں میں اس کے جو محبت کی نظر رکھے
میں احساں عمر بھر مانوں وہ احساں عمر بھر رکھے

اس غزل میں علاوہ مطلع کے محاوروں کے مندرجہ ذیل محاوروں سے شعر بنائے گئے ہیں اور تقریباً سب شعر اچھے ہیں ۔ انتظار رکھنا ۔ بھروسہ رکھنا ۔ قدم دیکھ کر رکھنا (دو بار) قدموں پر سر رکھنا ۔ کسی کو اپنا کر رکھنا ۔ چال چلنے کو گھر رکھنا ۔ مُنہ رکھنا ۔ ساتھ رکھنا ۔

یہ تو اُن محاوروں کا حال تھا جو ردیف کی خاطر باندھے گئے تھے ۔ ان کے علاوہ جو محاورات اشعار میں آ گئے ہیں وہ ان کے علاوہ ہیں ۔

لفظی رعایتیں مولانا کے کلام میں بعض بعض جگہ لفظی رعایتیں بھی نظر آتی ہیں ۔ جو شعرائے لکھنو کی خاص امتیازی چیز ہے چند شعر یہاں درج کئے جاتے ہیں ۔

نہ اترے بام سے جب تک نہ دوپہر گزرے
ہم ایسے سایہ دیوار سے بھی در گزرے

در گزرے میں چونکہ در ہے اس لئے اس کے واسطے دیوار پھر دیوار کے لئے پہلے مصرعہ میں بام کا لفظ لایا گیا ہے ۔

آ کے مجھ تک کشتیٔ مے ساقیا اُلٹی پھری آج کیا ندی بہی الٹی ہوا الٹی پھری

پاؤں پھیلائے ہیں داماں کی طرح ہاتھ کھینچا ہے گریباں کی طرح

نہ پاسکے گل مقصود اس بہار سے ہم اٹھا کے داغ چلے باغ روزگار سے ہم

نئے نئے الفاظ کی بھرتی اردو غزل میں جہاں انھوں نے عربی الفاظ اور جملے اضافہ کئے ہیں جو بالکل نامانوس اور غریب معلوم ہوتے ہیں۔ وہاں بعض ایسے الفاظ بھی داخل کئے ہیں۔ جو اس قابل ہیں کہ عام طور سے ان کو غزل میں استعمال کیا جائے۔ جیسے کچھی۔ کوٹھی۔ ارجن وغیرہ۔

غزل کے مضامین

مضامین کے لحاظ سے مولانا کی غزلوں کے اشعار چار حصوں میں منقسم ہوسکتے ہیں۔

(۱) عاشقانہ مضامین (۲) پند و نصائح (۳) علمی مضامین (۴) قطعات

عاشقانہ مضامین

مولانا نے اپنے دیوان کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ غزل گو کہے ہوئے مضمونوں کو بار بار کہتا ہے اور فخر اس بات پر کرتا ہے کہ کہنہ مضامین کو ہر مرتبہ لباس نو میں ظاہر کرتا ہے۔ مولانا کے اکثر اشعار پر یہ تعریف صادق آتی ہے۔ چند شعر یہاں پیش کئے جاتے ہیں:۔

ہوئے نہ ہم تو پشیماں کبھی وفا کرکے تجھے بھی شرم کبھی آئی ہے جفا کرکے

نگاہ اس سے لڑی دل کا غیر حال ہوا گناہ کس نے کیا آگئی قضا کس کی

منہ سے تو نے کہہ دیا جو آگیا مجھ کو یقیں جھوٹی قسمیں کس لئے ہیں عہد و پیماں کس لئے

قبر میں بھر خدا چین سے سوؤں کہ نہیں ہے ستم ساتھ جنازے کے بھی تو آتا ہے

بس نہ دیوانے پہ چلتا ہی نہ ہشیار پہ کچھ نہ تو دل آتا ہے قابو میں نہ تو آتا ہے

عاشقانہ مضامین کے بعض بعض شعر مولانا نے ایسے نکالے ہیں کہ اردو زبان کے لئے طرۂ ناز ہیں مثلاً اس خیال کو کہ عاشق معشوق کے سامنے اپنی داستان عشق کے بار بار دہرانے میں فرا حاصل کرتا ہے اس طرح بیان کرتے ہیں :۔

مری باتوں میں کیا معلوم کب سوئے کب جاگے
سرے سے اس لئے کہنی پڑی پھر داستاں مجھکو

معشوق عاشق کو دیکھ کر منہ پھیر لیتا ہے شاعر سمجھتا ہے کہ شاید وہ مروت کو تلاش کرتے ہیں۔

نگاہ آشنا کو دیکھ کر منہ پھیر لیتے ہیں
پس پشت اپنے گویا ڈھونڈھتے ہیں وہ مرت کو

عاشق بوسہ لینا چاہتا ہے معشوق انکار کرتا ہے اس انکار کی کیا اچھی تصویر کھینچی ہے۔

زلف برہم ہو کے الجھی چٹکیاں ہیکل نے لیں
بوسہ مجھ سے چھین کر بندے کا گوہر لے چلا

معشوق کے رخصت کے وقت اپنے عاشق کو مڑکے دیکھنے کو اس طرح نظم کرتے ہیں۔

کچھ نہ سمجھا کہ اس نے جاتے وقت ہائے کیوں منہ پھرا کے دیکھ لیا

شرم و حجاب کی کیا تصویر کھینچی ہے ملاحظہ ہو۔

شرم پہ کیوں یہ تبسم ہائے پنہاں کس لئے سر پہ آنچل کس لئے منہ پر ہے داماں کس لئے

عاشقانہ رنگ میں بعض بعض شعر ایسے بھی ہیں جن میں شعرائے عرب کے کلام کی طرح عریانی پائی جاتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ معشوق شاہدان بازاری سے کوئی ایک ہے۔

جلنے والے جل کے رہ جاتے ہیں کیا دیکھکر صبح کو ہونٹوں پہ جب شب کی مستی ہو نہیں
جلے ہیں غیر کیا کیا وہ جو خلوت سے مری نکلے پریشاں باندھ کر گیسو دوپٹہ اوڑھکر الٹا

اسی غزل کا ایک اور شعر ہے۔

نہ بھولیں گی کبھی وہ خلوت عیش کی راتیں کہ پردہ شام سے چھوڑا تو ہنگام سحر الٹا

تدر و کبک پر ہنس کر اٹھے خود لڑکھڑاتے ہیں
سبک کرتے ہیں ان کو پائینچے بار گراں ہو کر

ایک شعر میں بوسہ سے معشوق کا جو گال سرخ ہو گیا ہے اس کو بیان کیا ہے۔

میرے لب سے ہو گیا کیسا گل رخسار سرخ
تیرے لب سے برگ گل اس طرح شرمائی نہ تھی

چند شعر عاشقانہ رنگ کے یہاں درج کئے جاتے ہیں تا کہ ان کے رنگ طبع پر مزید روشنی پڑے۔

نہ دیکھ انداز آئینہ میں اپنا پوچھ لے ہم سے
زمانہ بھر سے اچھا اور ترے سر کی قسم اچھا

ادائیں سادگی میں کنگھی چوٹی نے خلل ڈالا
شکن ماتھے پہ ابرو میں گرہ گیسو میں بل ڈالا

وہ آنا پھیر کر سرتون کسی کا
وہ سر پہ گوشۂ دامن کسی کا

نگہ ہنگامہ بر ہم زن کسی کی
تبسم صاعقہ افگن کسی کا

سرو سنبل دیکھتے ہی خاک میں ملجائینگے
بال یہ بکھرے ہوئے چلنا یہ اٹھلایا ہوا

لاش پر میری یہ کہدینا کہ ہے وعدہ خلاف
اتنا کہہ دینا کہ کیا کہنا تمہاری یاد کا

پھر ذرا تم مڑ کے دیکھو تو سہی زندہ ابھی
کشتۂ تیر نگاہِ سرمگیں ہو جائیگا

بوسہ لینے کا تھا کلیوں کے چٹکنے پر جو وہم
شرم سے منہ بھی اس نے جانب گلشن کیا

گھل کے کاجل نے کیا آنکھوں کو نیلوفر کا پھول
جم کے مسی نے لبوں کو غیرت سوسن کیا

وہ میرا جستجو میں اس کی جانا بزم خوباں میں
اور اس کا بدگمانی سے یہ کہنا تم یہاں کیوں ہو

جفا کا ذکر جو چھیڑا کہا نہیں سنتے
وفا کو اس سے جو پوچھا کہا نہیں آتی

زمانۂ شباب کی یاد اور پیری کی تعریف میں کئی شعر لکھے ہیں۔ چونکہ دل سے نکلے ہیں۔ اس لئے دل پر اثر کرتے ہیں۔

خیال و خواب سا گزرا نظر مثل سراب آیا
یہی جلدی تھی جانے کی تو کیوں عہد شباب آیا

کروں ذکر کیا میں شباب کا
سنے کون قصہ یہ خواب کا

یہ وہ رات تھی کہ گزر گئی
یہ وہ نشہ تھا کہ اتر گیا

آ ئی تھی اب مزے پہ کہانی شباب کی کس لطف کے مقام سے افسانہ چھوٹ گیا!

قدم سے طاقت رفتار کچھ کہتی ہے رہ رہکر میں اب جھک جھک کے چلتا ہوں کہ سن لوں کیا جواب آیا

شباب و پیری کا آنا جانا غضب کا پردہ ہے فسانہ یہ رہ گئی بن کے گرد حسرت وہ اُڑ گیا رُخ سے رنگ ہوکر

اگر سو مرتبہ آئے بہار اے آسماں تو کیا کوئی گردش تو کرا ایسی کہ پھر فصل شباب آئے

وہ جوانی کے مزے وہ جھگڑے وہ وصل وہ ہجر شعبدہ تھا یہ بھی اک اس چرخ بے بنیاد کا

یہاں تک کہ ایک غزل اول سے آخر تک زمانہ شباب کی یاد میں لکھی ہے یہ غزل نہیں بلکہ جوانی کا مرثیہ۔ اور نظم طباطبائی کا کارنامہ ہے:

آخر ہوا شباب وہ صحبت نہیں رہی لو صبح ہوگئی شب عشرت نہیں رہی

پچھلے کی چاندنی ہیں یہ سر کے سفید بال جاڑوں کی دھوپ میں وہ حرارت نہیں رہی

سیماب کشتہ ہوگیا کافور شیب سے بے چین دل وہ شوخ طبیعت نہیں رہی

دل کو سنبھالے رہتے تھے پہلے ہیں اور اب خود کو سنبھالنے کی بھی طاقت نہیں رہی

مانند ابر گو کہ سراپا بخار ہیں مانند برق نبض میں سرعت نہیں رہی

ایام پیری نبض میں سرعت باقی نہیں رہتی۔

تلوؤں کو شوق خار مغیلاں نہیں رہا سر میں ہوائے وادی وحشت نہیں رہی

وہ انتظار وصل کی شب کا گذر گیا وہ بیقراری شب فرقت نہیں رہی

ماتم ہی ہم شباب کا کرتے تمام عمر مجبور ہیں کہ ہاتھ میں طاقت نہیں رہی

ہے کچھ دنوں کا ذکر کہ جینے کی تھی بہار لیکن اب اس چمن میں طراوت نہیں رہی

ایام پیری میں زندگی تلخ ہوجاتی ہے۔ اس کو اس طرح بیان کرتے ہیں۔

ہے کچھ دنوں کا ذکر کہ شیریں بہت تھی زیست لیکن اب اس شکر میں حلاوت نہیں رہی

جوانی کی آب و تاب بڑھاپے میں کہاں باقی رہتی ہے۔

ہے کچھ دنوں کا ذکر کہ رخ پر تھی آب و تاب　　لیکن اب آئینہ میں وہ طلعت نہیں رہی
گفتار میں مزہ ہے نہ رفتار میں ادا　　باقی وہ بول چال میں لذت نہیں رہی
اب یہ فروتنی یہ تواضع یہ انکسار　　وہ نخوتیں وہ شان وہ شوکت نہیں رہی
لبریز ہو چکا ہے جو پیمانہ عمر کا　　جام شراب ناب پہ رغبت نہیں رہی
جاتا رہا شباب، رہا غم شباب کا　　باقی رہا عذاب قیامت نہیں رہی
سکتے میں بھی نہ آئینہ دکھلائیں چارہ گر　　اب کوئی منہ دکھانے کی صورت نہیں رہی
بالیں پہ آکے ناز سے کہتی ہے یہ اجل　　کیوں اب تو سچ کہو کوئی حسرت نہیں رہی

بڑھاپے میں یارانِ گزشتہ یاد آتے ہیں تو آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں۔

آنسوؤں میں ہے مرقع مجمع احباب کا　　دیکھتے ہی دیکھتے آنکھوں سے پنہاں ہو گئے

پھر ان کی تلاش کا خیال پیدا ہوتا ہے۔

یارانِ بزم عشرت ڈھونڈوں کہاں میں تم کو　　تاروں کی چھاؤں میں یا پچھلے کی چاندنی ہیں

جب یہ تلاش بے سود ثابت ہوتی ہے تو ان کا دل چاہتا ہے کہ موت آجائے اور وہ ان سے جا ملیں۔

اسواسطے عدم کی منزل کو ڈھونڈتے ہیں　　مدت سے دوستوں کی محفل کو ڈھونڈتے ہیں

ایک جگہ اپنے ہم عمر دوست احباب کے مرنے کے قلق کا حسرت سے ذکر کرتے ہیں۔

جو پہلے جا چکے اے نظم میں ان کو تو کیا روؤں　　بڑھے جاتے ہیں وہ آگے جو میرے ساتھ والے ہیں

نازو ادا کی مصوری معشوق کے نازو ادا کی مصوری آسان کام نہیں۔ حافظ نے یہ مضمون ع بندۂ طلعت آں باش کہ آنے دارد' پر ختم کر دیا لیکن یہ نہیں بتایا کہ 'آنے' کیا چیز ہے۔ اس بات کو وہی شاعر اچھی طرح بیان کر سکتا ہے جس نے لکھنو کی فضا میں آنکھیں کھولی ہوں۔ جو لکھنو میں پرورش پایا ہو جو لکھنو کی صحبتوں سے فیض یاب ہوا ہو۔ اور جس کی ایک عمر لکھنو یا اہالیان لکھنو کے ساتھ بسر ہوئی ہو۔ اس لئے نظم طباطبائی کے دیوان میں ناز و ادا کی تصویروں کا البم نظر آئے تو کچھ تعجب نہ کرنا چاہیے

حیا میں ناز بھی ہے منہ پہ وہ آنچل جو ڈالے ہیں
ادا میں شرم بھی ہے اس طرح دامن سنبھالے ہیں

ایک دوشیزہ کی تصویر نظروں کے سامنے پھر جاتی ہے جس نے حیا سے منہ پر آنچل ڈال لیا ہے لیکن شوخی سے آنچل کے گوشہ میں سے دیکھتی بھی جاتی ہے اور ایک ہاتھ سے اپنے گرتے ہوئے دامن کو بھی سنبھال لیا ہے ۔

مڑکے دیکھا اس نے دل سینوں میں بسمل کردئیے
منہ اودھر پھیرا تو جو بسمل تھے بیجان ہو گئے

ہائے کیا نشتر نگاہی ہے ۔

کچھ نہ سمجھا کہ اس نے جاتے وقت
ہائے کیوں منہ پھر اکے دیکھ لیا

یہ دیکھنا تو صبر و قرار کی غارت گری کے لئے تھا اس لئے سمجھ میں نہیں آیا ۔

کہے سُنے سے ذرا پاس آکے بیٹھ گئے
نگاہ پھیر کے تیوری چڑھاکے بیٹھ گئے

دی جو گیسو میں گرہ آنچل سرک جانے لگا
جب لیا آنچل تو پھر گیسو پریشاں ہو گئے

یکایک پھیر لینا آنکھ کا بس قہر ڈھاتا ہے
اگر کہہ سُن کے بگڑو بھی تو مرگ ناگہاں کیوں ہو

کھلے دو پھول نیلوفر کے آنکھیں اس نے جب کھولیں
ستم کیسا کیا شرما کے ہاتھوں سے جو مل ڈالا!

چھڑکتے ہیں وہ اس ادا سے گلاب
کہ جاتا رہے ہوش آیا ہوا

معشوق کا سراپا دیوان میں بعض بعض شعر معشوق کے سراپا سے متعلق بھی ملتے ہیں جیسے

چمکتا ہے ایسا وہ کندن سا رنگ
کہ سونا ہو جیسے گلایا ہوا

لیکن ایک غزل میں کئی شعر سراپا کے نظم ہو گئے ہیں وہ اس طرح کہ شاعر باغ میں ایک ایک چیز کو دیکھتا ہے اور معشوق کے سراپا اور اس کے متعلقات کی طرف اس کا خیال منتقل ہوتا ہے ۔

سبک روی میں بھی غنچوں کے دل مسل ڈالے
یہ تیری چال میں شوخی ہے اے صبا کس کی

یہ کس حسین کی اترن ملی تجھے اے گل
ترے گلے میں ہے مسکی ہوئی قبا کس کی

یہ تیری عشوہ گری بے سبب نہیں نرگس
کھِچی ہوئی ترے آنکھوں میں ہے ادا کس کی

یہ تو ہے کیوں ہمہ تن گوش اے شگوفہ باغ | یہ گونجتی ہے ترے کان میں صدا کس کی
چمن میں جھومتے دیکھا ہے شاخ گل تجھکو | بلائیں لیں ترے ہاتھوں نے بارہا کس کی
یہ کس کے شوق میں اس کا جگر ہوا ہے لہو | یہ بے پسے ہوئے پامال ہے حنا کس کی

پند و موعظت غزل میں پند و موعظت کا خاص طور سے التزام نہیں ہوتا۔ غزل گو شعرا ایک آدھ شعر میں جہاں موقع مل گیا کوئی اخلاقی نکتہ بیان کر جاتے ہیں چنانچہ طباطبائی مرحوم نے ایک جگہ شرح دیوان غالب میں تحریر فرمایا ہے کہ "غزل میں رندی و شاہد پرستی کے مضمون بہت حسن دیتے ہیں مگر کبھی کبھی شعرا قافیہ کی طرف سے مجبور ہو کر اخلاقی مضامین بھی کہہ جایا کرتے ہیں، جہاں غزل میں ایسے مضامین کا التزام ہوتا ہے وہ غزل غزل نہیں رہتی بلکہ اس کو قصیدہ و موعظت کہنا چاہئے"۔

لیکن سخت تعجب ہوتا ہے جب دیوان طباطبائی میں اسی قبیل کے اشعار کی تعداد سب سے زیادہ نظر آتی ہے شاید اس کا سبب ان کی کبرسنی ہو کیونکہ عالم پیری میں آدمی پند و موعظت اور اپنے تجربات بیان کرنے کا عادی ہوتا ہے۔ اور اس وقت جذبات عشق کی تصویر کھینچنے پر

قحبہ چوں پیر شود پیشہ کند دلالی

کا مضمون صادق آتا ہے حالی مرحوم نے اس مضمون کو ایک قطعہ میں نہایت عمدگی سے بیان کیا ہے جس کا ذکر یہاں خالی از لطف نہیں۔

ہوئی ایوان جوانی کی بہار آخر حیف | طبع رنگیں تھی مئے عشق کی جب متوالی
اپنی روداد تھی جو عشق کا کرتے تھے بیاں | جو غزل لکھتے تھے ہوتی تھی سراسر حالی
اب کہ الفت ہی نہ چاہت نہ جوانی نہ امنگ | سر سے ہے سودا تہی عشق سے دل ہے خالی
گر غزل لکھئے تو کیا لکھئے غزل میں آخر | نہ رہی چیز وہ مضمون سجھانے والی
آپ بیتی جو نہ ہو ہے وہ کہانی بے لطف | گرچہ ہوں لفظ فصیح اور زباں ٹکسالی
ہاں مگر کیجئے کچھ عشق کا غیروں کے بیاں | لائیے باغ سے اوروں کے لگا کر ڈالی

کھینچیے وصل صنم کی کبھی فرضی تصویر کیجیے دردِ جدائی کی کبھی نقالی
تاکہ بھڑکائے جوانوں کے دل آتش کیطرح وہ ہوا جس سے دماغ اپنا ہوا ہے خالی
پر یہ ڈر ہے کہیں اپنی بھی وہی ہو نہ مثل
قحبہ چوں پیر شود پیشہ کند دلالی

افسوس ہے کہ ہمارے شعرا کے دیوان کی ترتیب سنہ واری نہیں ہوتی بلکہ ردیف وار ہوتی ہے ردیف وار ہونے کی صورت میں بھی اگر ہر غزل پر اس کا سنِ تصنیف درج کر دیا جائے تو اس سے ان کے کلام کی ترقی ظاہر ہوتی ہے اور جوانی اور بڑھاپے کے کلام کا امتیاز ہو سکتا ہے اس لئے ہم وثوق کے ساتھ نہیں کہہ سکتے کہ ان کے دیوان کے تمام پند و موعظت کے شعر ان کے ایام پیری کی یادگار ہیں۔

میں یہاں شاعری کا اخلاق سے کیا تعلق ہے بیان کر کے مضمون کو طولانی اور اصل مبحث سے دور کرنا نہیں چاہتا! لیکن اتنا عرض کر دینا ضروری خیال کرتا ہوں کہ شاعر کا کام صرف اپنے محسوسات و خیالات و جذبات کو بیان کرنا ہی نہیں ہے بلکہ اس کے سپرد قوم کی اصلاح بھی ہے اگر قوم بے غیرت پست ہمت اور مردہ ہو گئی ہے تو اس کو غیور باہمت اور زندہ کرنا اس کا کام ہے اگر ایسا نہ ہو تو شاعری قوم کی تباہی اور بربادی کا پیغام ہے۔ مثل حالی مرحوم کے یہ نصایح قوم کی موجودہ حالت کو پیش نظر رکھ کر نہیں کئے گئے بلکہ قافیہ نے ان سے یہ مضامین نظم کرائے ہیں۔ مثلاً نفس کشی کا قافیہ ذہن میں آتا ہے تو یہ شعر موزوں ہو جاتا ہے۔

ہے نفس کی اصلاح تو بس نفس کشی میں کچھ دل کی درستی ہے تو بس دل شکنی میں

شیریں سخنی کے قافیہ سے یہ مضمون نظم ہو جاتا ہے

ہرگز سخن تلخ میں دیکھی نہیں یہ بات کچھ کام نکلتا ہے تو شیریں سخنی میں

عبرت کا قافیہ یہ شعر کہلواتا ہے۔

ذرا سن تو سہی کیا شور ہے شہر خموشاں میں
جو عاقل ہیں یہاں آ کر سبق لیتے ہیں عبرت کا

یقین کے قافیہ سے ان کو یہ مضمون یاد آجاتا ہے کہ پہلے اپنی بات کا اعتبار پیدا کرنا چاہئے اس کے بعد جھوٹوں بھی کہہ دیا جاتا ہے تو یقین آجاتا ہے۔

پہلے اپنی بات کا پیدا تو کر لے اعتبار
پھر اگر جھوٹوں بھی کہدیگا یقیں ہو جائیگا

اعتبار کے قافیہ سے یہ مضمون سوجھتا ہے

مانو تو کچھ ہے اور نہ مانو تو کچھ نہیں
بازار دہر میں ہے چلن اعتبار کا

نیچے کے شعر میں قافیہ ہی سے گو مضمون پیدا ہوا ہے لیکن تشبیہات اور طرز بیان کی وجہ سے نہایت بلند پایہ ہو گیا ہے۔

دیکھا نشتر کوئی کاری تو زبانِ منت
دیکھا پتھر کوئی بھاری تو وہ احسان دیکھا

لیکن قافیہ کی ضرورت کے سوا بھی انھوں نے اخلاقی شعر کہے ہیں اور یہ نصائح تقریباً سب کے سب وہی ہیں جو ہماری مشرقی اخلاقی شاعری کے ایک زمانہ سے جزر چلے آتے ہیں۔ جیسے توکل، استغنا جود و سخا، نفس کشی، تواضع، گوشہ نشینی کی بھلائیاں اور حرص، غرور، تعلقات دنیاوی وغیرہ کی برائیاں بیان کی گئی ہیں لیکن ان کے علاوہ چند شعر دیوان میں ایسے بھی ملتے ہیں جو قوم کے جمود کو دور کرنے کے لئے لکھے گئے ہیں۔ مثلاً وہ اس خیال کو کہ زندگی اپنی حرکت کا نام ہے ستاروں کی حرکت سے اس کو کوئی تعلق نہیں۔ اس طرح ادا کرتے ہیں۔

سعد و نحس اپنا ہے اپنا ہی سکون و حرکت
کوکب ثابت و سیار سے کچھ کام نہیں

دوسری جگہ بیان کرتے ہیں ہمت ہو تو کامیابی نصیب ہوتی ہے

جہاں میں کامیابی ہے کرشمہ جوش ہمت کا
اگر یہ لہر آجاتی ہے بیڑا پار ہوتا ہے

جہلا جو تدبیر کو چھوڑ کر تقدیر پر بھروسہ کرتے ہیں ان کو یہ رائے دیتے ہیں :

پہلے تو وہ کر گذر جو کچھ کہے عزم بلند	بعد اس کے کر بھروسہ خواہش تقدیر پر

عاقبت اندیشی اور خود داری کی نصیحت کرتے ہیں ۔

یوں مرکہ نہ یاروں کو ہو بھاری ترا مردہ	یوں جی کہ طبیعت پہ نہ ہو بار کسی کی

یعنی ایسا مر کہ مرنے کے بعد دوستوں کو لاش اٹھانے کے لئے چندہ دینے کی ضرورت نہ پیش آئے اور اس طرح زندگی بسر کر کہ تیری زندگی کسی پر شاق نہ گزرے ۔

دو متقابل اور منافی چیزوں کو جمع کرنے سے شعر کا حسن اور دوبالا ہو گیا ہے ۔

تشبیہات و تمثیلات دیوان طباطبائی میں کثرت سے ایسی تشبیہات و تمثیلات ملتی ہیں جو اردو دیوانوں میں عام طور سے نظر نہیں آتیں ۔ یہ ان کے دنیا اور کتابوں کے کثیر مطالعہ کا نتیجہ معلوم ہوتی ہیں ۔

ہمیشہ کوچ و مقام اپنا راہی خضر رہ طریقت	رکا تو میں سنگ میل بنکر چلا تو آواز رنگ ہو کر

سنگ میل اور آواز رنگ کی خضر رہ طریقت سے کیا بدیع تشبیہ ہے ۔

شباب و پیری کا آنا جانا غضب کا پُر درد ہے فسانہ	یہ رہ گئی بن کے گرد حسرت وہ اڑ گیا رخ سے رنگ ہو کر

شباب کے جانے کو رخ کے رنگ پریدہ سے اور پیری کے رہ جانے کی گرد حسرت سے تشبیہ کیا خوب ہے ۔

جہاں کس کا ہے عمر گریز پا کس کی	یہ چلتی چھاؤں ہی ہوتی ہے آشنا کس کی

جہان اور عمر گریز پا کو چلتی چھاؤں سے تشبیہ دی ہے اور تشبیہ متحرک بہ متحرک ہے اور وجہ شبہ حرکت ہے

اس سے پیشتر مولانا کا مرثیہ شباب کا پیش کیا جا چکا ہے اس میں شباب کو شب عشرت سے پیری کو صبح سے سر کے سفید بالوں کو پچھلے کی چاندنی اور جاڑوں کی دھوپ سے جوانی کی بہار کو چمن کی طراوت سے جوانی کی آب و تاب کو آئینہ کی طلعت سے تشبیہ دی گئی ہے ۔

یہ تشبیہیں پر کیف ہیں اور ان میں لطیف مماثلتیں پائی جاتی ہیں جن سے طبیعت میں ایک سرور

پیدا ہوتا ہے اور آنکھوں کے سامنے پیری اور جوانی کی ایک تصویر کھنچ جاتی ہے

روانی عمر کی دیکھی کبھی گردش ستاروں کی — تبسم برق کا اُس کو اِسے رقصِ شرر جانا

فنا کی منزلوں میں ساتھ کا فور و کفن بھی تھا — اسے رخت سفر سمجھا اسے گرد سفر جانا

جوش و سرمستی ہم مولانا طباطبائی کی طویل العمری کے باعث یہ توقع نہیں رکھ سکتے تھے کہ انکے کلام میں جوش و سرمستی کے اشعار بھی پائے جائیں گے لیکن کہیں کہیں ایسے اشعار بھی پائے جاتے ہیں جس سے سخت حیرت ہوتی ہے۔ چند شعر پیش کئے جاتے ہیں :

تاکِ انگور درختوں پہ چڑھی تھی کل تک — آج تو پھاند پڑی باغ کی دیواروں پر

جو منع ہو تو ہیں سیہ مستیاں بہاریں نظم — تو جھوم جھوم کے کالی گھٹا نہیں آتی

بانہیں گردن میں مری ڈال دے تو دے کے شراب — منہ جو پوچھوں بھی تو مل کر ترے رخساروں پر

انگریزی اثرات مولانا کے کلام پر جس طرح عربی دانی کے اثرات پائے جاتے ہیں اسی طرح انگریزی شاعری اور خیالات سے بھی ان کا کلام متاثر ہے۔ چنانچہ وہ نظم طباطبائی کے دیباچہ میں تحریر فرماتے ہیں: "یورپ کا ایک ادیب ہر شاعر و خطیب کو جتاتا ہے کہ (۱) کلام ایسا ہو کہ اس کا مطلب دل میں اتر جائے (۲) اس کی تخیل سے لطف آئے (۳) کسی بات کا جوش اس سے پیدا یا فرو ہو جائے (۴) کسی بات کے کرنے نہ کرنے پر آمادہ ہو جائے (۵) اسے یاد رکھے جس کلام سے (۱) کوئی اطلاع نہ حاصل ہو (۲) کچھ مزہ نہ ملے (۳) کچھ جوش نہ پیدا ہو (۴) کسی بات کے عزم یا ترک پر آمادگی نہو (۵) وہ کلام یاد بھی نہ رہے گا۔

ان خیالات سے ان کی شاعری کہاں تک متاثر ہوئی ہے اس کا جواب خود ان کا کلام دیکھتا ہے۔ اور خود انگریزی کی تتبع میں انھوں نے کئی نظمیں بھی لکھی ہیں اور گریز ایلیجی کا ترجمہ بھی کیا ہے۔ جس کا ذکر اپنے مقام پر آئے گا۔ یہاں صرف ان کی غزل کے دو شعر نقل کئے جاتے ہیں۔ جو انگریزی شاعری کے اثرات لئے ہوئے ہیں۔

گریز ایلیجی کے ایک بند کے یہ دو سطریں ہیں :-

FULL MANY A FLOWER IS BORN TO BLUSH UNSEEN,

AND WASTE ITS SWEETNESS ON THE DESERT AIR

جس کا ترجمہ مولانا کی زبان ہی سے سن لیجے ۔

ہزاروں پھول دشت و در میں ایسے بھی کھلے ہونگے ۔۔۔ کہ جن کے مسکرانے میں ہے خوشبو مشک اذفر کی

تقریباً یہی خیال اپنے متعلق ایک مقطع میں ظاہر کیا ہے :

قدر اے نظم کسی نے بھی نہ جانی ہرگز ۔۔۔ دامن دشت میں مہکا گل خود رو ہوکر

ولیم کوپر کی ایک مشہور نظم THE SOLITUDE OF ALAXENDER SELKERK کے ابتدائی اشعار یہ ہیں I AM THE MONARCH OF ALL I SURVEY

MY RIGHT THERE IS NONE TO DISPUTE

ان خیالات کو ایک شعر میں اس طرح ادا فرماتے ہیں :

نہ تسلط ہے کسی کا نہ مزاحم کوئی ۔۔۔ سو خزانے ہو تو صدقے کروں ویرانے پہ

عالمانہ رنگ مولانا طبا طبائی کے اکثر اشعار سے ان کی علمیت نمایاں ہے اکثر اشعار جو اب تک پیش کئے گئے ہیں وہ اس کے شاہد ہیں ۔ بعض بعض شعروں میں وہ کوئی تلمیح لے آتے ہیں ۔یا کوئی سائنٹفک مسئلہ کو حل کرتے ہیں یا عربی فقرے یا الفاظ سے شعر کو سنگین کرتے ہیں ظاہر ہے کہ غزل کو ان مضامین سے کوئی تعلق نہیں مگر مولانا طبا طبائی کے لئے شاعری باعث ناز نہیں بلکہ وہ شاعری کے لئے باعث ناز ہیں، ان کے علم وفضل کے سامنے شاعری کوئی چیز نہیں ۔ اس لئے ان کی شاعری کا مطالعہ فقط شاعری کے نقطۂ نظر سے نہ کرنا چاہئے اور اگر ایسا کیا جائے تو ان کی شاعری کے ایک کثیر حصہ سے ہم کو محروم ہوجانا پڑے گا ۔چند شعر یہاں پیش کئے جاتے ہیں :-

کوئی حد بھی ہے پستی کی ہزاروں سال جب گزرے ۔۔۔ تو ہم تک روشنی پہنچی ہے شعرائے یمانی کی

قطعات

اکثر شعرا کے برخلاف مولانا طبا طبائی کی غزلیں قطعہ بند ہیں۔ غزل میں قطعہ لکھنا آسان کام نہیں۔ کیونکہ قافیہ و ردیف کی پابندی سے کوئی مسلسل مضمون نہیں باندھ سکتے۔ کیونکہ مثنوی کی طرح اس میں آزادی نہیں ہوتی لیکن اس قید کے باوجود طبا طبائی نے نہایت کامیاب قطعے لکھے ہیں نمونہ کے طور پر چند قطعات پیش کئے جاتے ہیں: ؎

مانا کہ تو نے غیر کیا نظم اپنا حال　　معلوم اس کو حال پریشاں نہ ہو تو کیا
مانا کہ تو نے جوگ لیا دردِ عشق میں　　اس حال پر بھی گر کوئی پرساں نہ ہو تو کیا
یہ تو بتا کہ چاکِ گریباں سے فائدہ　　جب تیرا ہاتھ اور اس کا گریباں نہ ہو تو کیا
مانا کہ تیرے اشک میں گوہر کی ہی چمک　　عارض پہ اس کے وصل میں غلطاں نہ ہو تو کیا
اچھا یہی سہی کہ وہ محشر خرام ہے　　تلووں کے نیچے دیدۂ حیراں نہ ہو تو کیا
یوں خاک و خوں میں لوٹ گئے تم تو کیا حصول　　قاتل کا اپنے ہاتھ میں داماں نہ ہو تو کیا
جھک جھک کے ڈھونڈھتا ہے عبث اس گلی میں تو　　اس خاک میں ترا دلِ نالاں نہ ہو تو کیا
جاتا ہے اس کے در پہ تو اتنا سمجھ تو لے　　گر تیرے روشناسوں میں درباں نہ ہو تو کیا
گر اذنِ عام غیر کو ہے تو ہوا کرے　　تیرا گزر وہاں کسی عنواں نہ ہو تو کیا
کہتے ہو جو پڑیگی مصیبت اٹھائیں گے　　لیکن وہ ظلم کر کے پشیماں نہ ہو تو کیا
سوچے ہو جان دینگے جو دشوار ہوگا وصل　　مرنا بھی میری جان جو آساں نہ ہو تو کیا

لکھنو کی یاد میں ایک غزل لکھی ہے۔ اس کی ردیف بھی لکھنو ہی ہے غزل کیا ہے مرثیہ ہے۔

مجھ کو سمجھو یادگارِ رفتگانِ لکھنو　　ہوں قدآدم غبارِ کاروانِ لکھنو
میرے ہر آنسو میں اک آئینہ تصویر ہے　　میرے ہر نالے میں ہے طرزِ فغانِ لکھنو
ڈھونڈھتا ہے اب کسے لے کے چراغِ آفتاب　　کیوں مٹایا اے فلک تو نے نشانِ لکھنو
لکھنو جن سے عبارت تھی ہو وہ ناپدید　　ہے نشانِ لکھنو باقی نہ نشانِ لکھنو

اب نظر آتا نہیں وہ مجمع اہل کمال
کھا گئے ان کو زمین و آسمان لکھنو

پہلے تھا اہل زباں کا دور اب گردش میں ہیں
چاہیئے تھی تیغ اردو کو فسان لکھنو

مرثیہ گو کتنے یکتائے زمانہ تھے یہاں
کوئی تو اتنوں میں ہوتا نوحہ خوان لکھنو

چوٹ ہے انیس و دبیر پر جنھوں نے ساڑھے بارہ سو برس کے پیشتر کے واقعات بیان کرکے ایک ہنگامہ مچادیا لیکن آنکھوں کے سامنے ملک پر اور بادشاہ پر جو بپتا ہی آئی اس پر ایک بند نہ لکھا اور وہ لکھتے بھی کیوں یہ چیز کچھ روزی کمانے کے لئے تو تھی نہیں جس کے لئے وہ تکلیف اٹھاتے ۔

یہ غبار ناتواں خاکستر پروانہ ہے
خانداں اپنا تھا شمع دودمان لکھنو

چلتا تھا جب گھٹنوں اپنے یہاں طفل رضیع
سجدہ کرتے تھے اسے گردن کشان لکھنو

اشارہ ہے اپنی عالی دودمانی کی طرف

عہد پیرانہ سری میں کیوں نہ شیریں ہو سخن
بچپنے میں میں نے چوسی ہے زبان لکھنو

گلشن فردوس پر کیا ناز ہے رضواں تجھے
پوچھ اس کے دل سے جو ہی رتبہ دان لکھنو

بوئے انس آتی ہے حیدر خاک مٹیابرج سے
جمع ہیں اک جا وطن آوارگان لکھنو

بچے اور والدین

چند نفسیاتی مسائل

از

میر باقر علی ام اے

انسانی سیرت کی تشکیل میں گھر کے نفسیاتی ماحول کو بڑا دخل ہے۔ تحقیق جدید کے انکشافات نے ثابت کر دیا ہے کہ بچہ جس وقت اپنے گھر کے افراد کی طرف کوئی طرز اختیار کرتا ہے تو اُس طرز کا بھی تعین ہو جاتا ہے جو وہ بڑا ہو کر گھر کے باہر اپنے ہم جنسوں کی طرف اختیار کریگا۔ ایک شخص زندگی کے اہم اور پیچیدہ مسائل کو جس زاویہ نگاہ سے دیکھتا ہے وہ محض اُسی زاویہ نگاہ کا اعادہ ہوتا ہے جس سے وہ اپنے زمانہ طفلی میں اُن دشواریوں اور مسائل کو دیکھا کرتا تھا جن سے اُس کو اپنے گھر کی چھوٹی دنیا میں دوچار ہونا پڑا تھا۔ گھر ہی وہ پہلا ماحول ہے جس میں رہ کر خود اعتمادی کا اہم سبق سیکھا جاتا ہے اور آئندہ کی تعلیمی، تمدنی، اور سیاسی ترقیوں کا دارومدار اسی سبق کو کامیابی کے ساتھ حاصل کرنے پر ہوتا ہے۔ والدین کی توتوں اور اُن کی رائے پر ضرورت سے زیادہ تکیہ فرد کی جدت کو فنا کر ڈالتا ہے۔ برخلاف اس کے، والدین کی رہبری اور اُن کے احکام کی شدید مخالفت ہر قسم کی پابندیوں اور اقتدار سے متنفر کر دیتی ہے اور نہ تو اس کا امکان باقی رہتا ہے کہ فرد گذشتہ کے تجربہ سے مستفید ہو اور نہ اس کا کہ زمانہ حاضر میں سوسائٹی کے ساتھ اتحاد عمل کرے۔

زمانۂ طفلی میں بچہ اپنی جسمانی ضرورتوں کی تکمیل کے لئے اپنے والدین کا بالکل محتاج ہوتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ وہ اشاروں کے ذریعہ یا رو کر اپنے خواہشات کا اظہار کرسکتا ہے جس کی اطلاع پاکر والدین اُن کی تکمیل کر دیتے ہیں مگر جیسے جیسے بچہ بڑا ہوتا جاتا ہے یہ ضرور ہوجاتا ہے کہ وہ ان ضرورتوں کو خود پورا کرنا سیکھے' کھانا سیکھے' پہنا سیکھے' اپنے جسم کو پاک صاف رکھنا سیکھے' چلنا سیکھے وغیرہ بعض دفعہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ بچہ خود کسی کام کو انجام نہیں دیسکتا۔ عموماً اس کے پاس اس دشواری کا یہ حل ہوتا ہے کہ والدین کی امداد کا طالب ہو جو نہایت آسانی سے اُس کام کو کرسکتے ہیں۔ والدین اس قسم کی مدد دینے سے خوش بھی ہوتے ہیں بچہ کی نشو ونما کے ایک خاص زمانہ میں اس قسم کی امداد ناگزیر اور بالکل فطری ہے لیکن اس کا بھی اندیشہ ہے کہ یہ امداد بچہ کے لئے خطرناک ثابت ہو خصوصاً جبکہ اُس کی عمر اور فہم کا کوئی لحاظ نہ کیا گیا ہو اور یہ امداد نہ صرف نہایت مشکل مواقع پر دیجائے بلکہ ایسے مواقع پر بھی جبکہ بچہ اپنی ذاتی کوشش سے اس کام کو کرسکتا تھا۔ اگر بغیر سوچے سمجھے ہر وقت مدد دی جائے تو بچہ مشکلات کے سامنے دوسروں پر تکیہ کرنیکا خوگر ہوجاتا ہے اور یہ عادت مدت العمر باقی رہ کر اس کو سوسائٹی کا ایک ایسا بیکار و بےبس فرد بنا دیتی ہے جس سے مسلسل کوشش یا محنت شاقہ ممکن ہی نہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ قابلیت اور تجربہ میں اضافہ کے ساتھ' امداد کے مواقع بھی کم ہوتے جائیں یہانتک کہ بچہ بڑا ہو کر دنیا کے تمام کاروبار کو اپنی ذاتی کوشش سے بجالائے۔ یہاں اُن غیر معمولی مواقع سے بحث نہیں جب معاشی نظام کا اصولِ تقسیم عمل انسان کو مثلاً ڈاکٹر وغیرہ کا محتاج بنا دیتا ہے۔

والدین نہ صرف بچہ کے ضروریات جسمانی کو پورا کرتے ہیں بلکہ اُس کے طریق زندگی کا بھی تعین کرتے ہیں۔ بچہ کب کھائے' کب کام کرے' کب کھیلے اور کب سوئے' ان ساری چیزوں کا تصفیہ والدین ہی کرتے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ کھیل کود کو اُس کی مرضی پر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ آگے چل کر والدین کی جگہ مدرسین لے لیتے ہیں۔ ایک عرصہ دراز کے بعد ہی کسی فرد کو اس کی اجازت دیجاتی ہے کہ وہ اپنے وقت کا جیسا چاہے استعمال کرے۔ اخلاقی حیثیت سے بھی بچہ والدین کے ہی فیصلوں پر بھروسہ کرتا ہے بعض میلانات' خیالات' اور افعال کو اُس کے سامنے اچھا یا برا کہا جاتا ہے۔ اُس وقت بھی جب وہ خود فیصلہ کرنا شروع کرتا ہے کہ کونسا فعل اچھا ہے اور کونسا برا' اسکے فیصلے اپنے بڑوں سے ماخذ کئے ہوئے اخلاق کے صرف عکس ہوتے ہیں۔ والدین کے فیصلہ اور رائے پر انحصار زمانۂ طفلی میں نہایت ضروری اور بالکل فطری ہے لیکن کامیاب طریق پر

ذہن وسیرت کی نشوونما اس بات کی مقتضی ہے کہ فکر وعمل میں بتدریج، جیسے جیسے قابلیتیں پختہ ہوتی جائیں اور تجربہ وسیع ہوتا جائے آزادی حاصل کیجائے۔ وہ شخص جو صرف دوسروں کے ہدایات پر عمل پیرا ہوسکتا ہے دنیا میں کسی اعلیٰ مرتبہ پر پہنچنے کے قابل نہیں ہوتا، عام اس سے کہ وہ ان ہدایات کی بجا آوری میں کتنی ہی فرماں برداری اور احتیاط کیوں نہ برتے۔ اُس شخص میں جو دوسروں کے احکام اور آراء کی طفلانہ محتاجی سے بلند نہ ہوگیا ہو، کیرکٹر کا وہ ضروری جز مفقود ہوگا جس کے بغیر اعلیٰ درجہ کی تمدنی اور معاشی ترقی کا حصول ممکن نہیں۔

ایسے شخص پر اخلاق کے بلند ترین مدارج کے دروازے بھی بند ہونگے۔ اسکے اخلاقیات میں نہ ترقی کی صلاحیت ہوگی اور نہ بڑھتے ہوئے تجربات کے سامنے ترمیم کی قابلیت حقیقت میں وہ اخلاقی شعور سے ہی بے بہرہ ہوگا۔ اخلاقیات کو وہ ایک خارجی اور تکلیف دہ چیز خیال کریگا اور کوئی تعجب نہیں جو خارجی دباؤ کی عدم موجودگی میں اپنے اخلاقیات سے ہی ہاتھ دھو بیٹھے۔ پہلے پہل بچہ دھمکیوں یا سزا کے خوف سے یا انعامات حاصل کرنے کے لئے اپنے والدین کی خواہش کے مطابق عمل کرنا سیکھتا ہے۔ پھر وہ زمانہ آتا ہے جب مختلف اشخاص اور حالات کا تجربہ کر کے درست عمل کا وہ تصور حاصل کیا جائے جس میں خارجی دباؤ یا ترغیب کا کوئی لگاؤ موجود نہ ہو۔ بلکہ خارجی دباؤ کی جگہ ذاتی یقین لے لے۔ اس یقین کے مختلف مدارج ہوتے ہیں۔ اخلاقی عمل یا تو کسی ذاتی فائدہ کے لئے کیا جاتا ہے یا تمام انسانوں کے فائدہ کے لئے یا اس کا یقین ہوجاتا ہے کہ یہ عمل قانون فطرت کے مطابق ہے۔ اخلاقیات کے بلند ترین مدارج کا حصول تب ہی ممکن ہے جب ہر قسم کے خارجی دباؤ سے آزادی حاصل کیجائے اور ذاتی قوتوں، فکر، اور ضبط کی ترقی کا موقع ملے۔

اوپر کے بیان سے یہ مقصد نہیں کہ والدین کی محافظت سے قبل از وقت آزادی یا اُن کے احکام کی شدید مخالفت خطروں سے خالی نہیں۔ لیکن عموماً یہ ہوتا ہے کہ صغیر سنی میں اور ابتدائی بلوغ میں بچہ اپنے والدین کا بڑی حد تک محتاج ہوتا ہے اور والدین کی بڑی ہوی قوتیں، زیادہ معلومات، اور وسیع تجربات بچہ کے دل میں اُن کی عزت پیدا کرتے ہیں اور اُس کا امکان کم ہوتا ہے کہ اُن کی مخالفت کیجائے۔ لیکن بعض اوقات بیدا نہ اختیارات کے ظالمانہ استعمال سے مخالفت پیدا ہوسکتی ہے۔ والدین کی سخت تربیت بچہ میں جذبۂ مخالفت پیدا کرسکتی ہے اور یہ ہوسکتا ہے کہ اُن کی تربیت کا مفید جز بھی نظر انداز ہوکر رائگاں ہوجائے۔ ایک ظالم باپ ایک ایسے مخالف بچہ کا باعث ہوسکتا ہے

جو نہ صرف اُس کی نصیحتوں اور احکام پر عمل پیرا نہیں ہوتا بلکہ بڑا ہو کر اُن اشخاص کے احکام اور ہدایات کی بھی مخالفت کرتا ہے جو نفسیاتی حیثیت سے محض اُس کے باپ کے بدل ہوتے ہیں۔ یہ فرد غیر شعوری طور پر اپنے جذبۂ مخالفت کو ہر قسم کے مظاہرۂ قوت پر منتقل کردیتا ہے اور ایسے افراد میں کسی بھی قسم کی تمدنی زندگی کے ساتھ خود کو ہم آہنگ بنانے کی صلاحیت نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ مزدور پیشہ جماعت میں ہڑتال وغیرہ کی سی مخالفتیں پائی جاتی ہیں۔ اس جماعت کے افراد کا اپنے بچوں سے سلوک رواداری پر مبنی نہیں ہوتا بلکہ ظالمانہ ہوتا ہے۔ یہی پدرانہ مخالفت صورت بدل کر قانون شکنی اور جرائم میں ظاہر ہوتی ہے۔

ماہرین نفسیات اس بات پر متفق ہیں کہ بچوں کی موجودگی والدین میں جبلی طور پر محبت پیدا کردیتی ہے۔ حیاتیاتی نقطۂ نظر سے اس محبت کی شدید ضرورت ظاہر ہے۔ بچے بھی اس محبت کا جواب دیتے ہیں۔ اپنے جسمانی ضروریات کی تکمیل کے لئے بچہ ایک عرصہ دراز تک والدین کا محتاج ہوتا ہے۔ فطرت انسانی کا یہ خاصہ ہے کہ وہ اُن اشیاء کو بہ نظر پسندیدگی و الفت دیکھے جو اس کی حیاتیاتی ضرورتوں کو پورا کرتی ہیں۔ بچہ کا نفس بھی اُن اشیاء کی طرف وہ خاص طرز اختیار کرتا ہے جو آگے چل کر محبت کہلاتی ہے۔ اور چونکہ بچہ کی ساری ضرورتوں کی تکمیل ایک زمانہ تک والدین ہی کرتے ہیں اسلئے یہ ضروری ہے کہ بچہ اُن سے محبت کرنے لگے۔ علاوہ ازیں بچہ نہ صرف اپنے جسمانی ضروریات کی تکمیل کیلئے والدین کا محتاج ہوتا ہے بلکہ ان ضرورتوں کو خود پورا کرنا سیکھنے کے مواقع کے لئے بھی۔ کوئی بھی کام سیکھنے کے لئے اثر پذیری اور نقل کی ضرورت ہے۔ بڑی حد تک اثر پذیری کا تعلق محبت سے ہے اور نقل کی یہ حالت ہے کہ ہم سب اُن لوگوں کی نقل کرتے ہیں جن کا ہم ادب کرتے ہیں، جن کا بھروسہ کرتے ہیں، اور جن سے محبت کرتے ہیں۔ ایسی حالت میں بچہ فطرتاً اپنے والدین کی طرف احترام اور محبت کی طرز اختیار کرتا ہے تا بہ آسانی اُن کی قابلیتیں، عادات، اور خیالات حاصل ہوجائیں۔

بچوں کے ساتھ والدین کی محبت اُن کی دوسری دلچسپیوں کی مناسبت سے ہوتی ہے۔ ایسے والدین کی محبت جن کا اپنے بچوں کی پرورش کے علاوہ کوئی اور مشغلہ نہ ہو ایسے والدین کی محبت سے شدید تر ہوگی جن کی محبت اور دلچسپیوں پر کسی اور قسم کی مانگ ہو یا جن کے اور بھی مشاغل ہوں۔ صرف ایک بچہ کے باپ کی محبت اُس باپ کی محبت سے بدرجہا زیادہ ہوگی جس کو ایک سے زیادہ بچے ہوں۔ ایسے باپ کی محبت جس کی بی بی انتقال کرگئی ہو یا ایسی ماں کی محبت جسکا

شوہر انتقال کر گیا ہو اس وجہ سے بھی زیادہ ہوگی کہ اُن کی محبت کا مرکز سوائے بچوں کے اور کوئی نہیں ہوتا۔ اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ خاطر خواہ اخلاقی اور نفسی ترقی کے لئے والدین کی محبت بچہ کے ماحول کا ایک نہایت ضروری جزو ہے اگر یہ میسر نہ آئیگی تو بچہ کو محسوس ہوگا کہ اُس کے ساتھ ظلم کیا گیا اور یہ محبت کا بھوکا مدت العمر اُس محبت کا متلاشی رہے گا جس کی اُس کو زمانہ طفلی میں ضرورت تھی اور جو کہیں بھی نصیب نہ ہوگی۔ کوئی تعجب نہیں جو ایسی صورت میں بچہ اپنے والدین سے متنفر ہو جائے اور آگے چل کر یہ نفرت سارے انسانوں پر منتقل ہو جائے یا اپنی محبت کا کہیں بھی کوئی جواب نہ پاکر وہ اپنی ذات ہی کو اُس محبت کا مرکز بنالے جو بہتر حالات میں اُسکے ہم جنسوں کے فائدہ کے لیے صرف ہو سکتی تھی۔ غیر معمولی حالات میں بچہ کے نفسیاتی ماحول کی یہ خرابی عمر بھر کے جرائم کا بھی سبب ہو سکتی ہے۔ ایسا بچہ جسکی تمنا نہ کی گئی ہو' ایسا بچہ جس کی موجودگی نفسیاتی یا معاشی اسباب کی بنا پر موجب زحمت ہوئی ہو' نہایت خراب حالات میں زندگی میں قدم رکھتا ہے۔ آخر کار ایسے تباہ کن نتائج پیدا ہوتے ہیں جن کے اثرات سے خود اُس کی ذات اور سوسائٹی محفوظ نہیں رہ سکتی۔ لیکن اس کے یہ معنی نہ ہوں گے کہ بچہ کی نشو و نما کے ساتھ بتدریج والدین کی محبت کی شدت کم نہ ہو۔ والدین کی محبت' اپنا ابتدائی مقصد پورا کرکے' بچہ بڑا ہو جانے کے بعد بھی اگر اسی ابتدائی شدت سے باقی رہیگی تو بچے اور والدین دونوں کے لئے مضر ثابت ہوگی۔ جس طرح بچے کے اخلاق اور کیارکٹر کی کامیاب تشکیل کے لئے یہ لازمی ہے کہ اُس کو آہستہ آہستہ آزادی دیجائے تاکہ طفلانہ محتاجی سے وہ دور ہوتا جائے' بالکل اسی طرح یہ بھی لازمی ہے کہ بچہ کی نشو و نما کے ساتھ والدین اپنی توجہ اور محبت کی شدت کو کم کرتے جائیں۔ اگر ایسا نہ ہوگا اور والدین اُسی طرح اپنے بچوں سے محبت کرتے جائیں گے تو بچہ کی نفسی ترقی میں رکاوٹ پیدا ہوگی۔ اور اگر بچہ باوجود اس مزاحمت کے اپنی محبت کو دنیا کی اور چیزوں پر منتقل کرنے میں کامیاب ہوگا' تو والدین کو بڑی مایوسی ہوگی اور بچہ کے اس عمل کو وہ اُس کی ناشکر گزاری اور احسان فراموشی پر محمول کرینگے۔ عقلمندی کا تقاضہ تو یہ ہے کہ بچہ کی نفسی ترقی میں رکاوٹیں پیدا کرنے کے عوض اس کا موقع دیا جائے کہ وہ اپنی نفسی قوتوں کو گھر کے باہر بھی صرف کر سکے۔ ظاہر تو یہ نہایت ہی مستحسن معلوم ہوتا ہے کہ بچہ بڑا ہو کر بھی والدین ہی کا گرویدہ رہے۔ یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ اگر اُن لوگوں سے محبت نہ کی جائے جو ہمارے وجود کے باعث ہوئے' جنھوں نے ہماری بیکسی اور بیبسی کے عالم میں ہماری حفاظت کی' ہماری پرورش کی' اور جنھوں نے خود ہزارہا مصیبتیں

اٹھائیں اور ہم کو آرام دیا، تو پھر کس سے کیجائے۔ لیکن اس قسم کے غیر معمولی تعلق کی موجودگی جبکہ اس کی حیاتیاتی ضرورت باقی نہ رہی ہو، کسی نہ کسی شخصیت کی سخت خامی کا باعث ہوتی ہے۔ والدین کے نقطۂ نظر سے "نیک لڑکا" کوئی ضرور نہیں کہ زندگی میں بھی اعلیٰ درجہ کی کامیابی حاصل کرے۔ ایسے لڑکے کا کوئی عمل جسکی بنا پر وہ اپنی شخصیت کو طفلانہ محبت کی خاطر فنا کر ڈالے، قابل رحم ہے نہ کہ قابل تعریف۔ اور والدین کا بھی ایسا عمل جسکی بنا پر وہ اپنے عزیز بچہ کی ترقی میں مزاحم ہوتے ہیں، کچھ نہیں تو خودغرضی پر مبنی ضرور ہے۔

الحاصل بچہ کی تربیت میں جو بات پیش نظر رہنی چاہئیے وہ یہ ہے کہ اس کو بالکل بے بسی کی حالت سے نکال کر ایسا آزاد فرد بنایا جائے جو تنہا زندگی کے تمام مسائل کا مقابلہ کرسکے۔ یہ کوئی آسان کام نہیں۔ عموماً والدین کے لئے یہ نہایت آسان ہوتا ہے کہ وہ بچوں کی مدد کریں بہ عوض اسکے کہ ان کو اپنی آپ مدد کرنے کی اجازت دیں۔ یہ بھی ہوتا ہے کہ بچے خود محض سستی کی وجہ اسکو ترجیح دیتے ہیں کہ والدین ہی سب کچھ کردیں بہ عوض اسکے کہ خود تکلیف اٹھائیں۔ اس خوف سے بھی کہ کہیں بچے کوئی مصیبت نہ ڈھالیں، والدین بچوں کو آزادی دینے سے پس وپیش کرتے ہیں۔ ان کی ضرورت سے زیادہ محبت بھی اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ بچوں کو ان کے حال پر چھوڑ دیا جائے۔ مگر والدین کی محافظت اور محبت سے بتدریج علیحدگی فرد کی کامل ترقی کے لئے ازحد ضرور ہے، اور وہ والدین جو اپنے بچوں کی تربیت میں اس علیحدگی کی ضرورت کا لحاظ نہیں کرتے حقیقی معنوں میں اپنے فرائض سے باخبر اور بچوں کے بھی خواہ کہلانے کے مستحق نہیں۔

بچوں کو اس کا موقع دیا جانا چاہئیے کہ وہ روپیہ پیسے کے استعمال سیکھیں۔ ان کو اس غرض کے لئے چھوٹی چھوٹی رقمیں دیجانی چاہئے اور بڑی رقمیں بھی جیسے جیسے ان کی عمر بڑھتی جائے۔ ان کو خود اپنے کپڑے، کتابیں اور دوسری ضرورت کی چیزیں خریدنے کا موقعہ ملنا چاہئے۔ بچوں کو تنہا سفر کرنیکی ترغیب دلانی چاہئے۔ نئے نئے مقامات پر جانے سے اور نئے نئے لوگوں سے ملنے سے مشکلات کو حل کرنے کی اور ہر قسم کے انسانوں سے کامیابی کے ساتھ تعلق پیدا کرنے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔ سب سے زیادہ اس بات کی کوشش کیجانی چاہئے کہ بچہ میں نہ تو خود پسندی پیدا ہو اور نہ احساس کمتری۔ خود پسند بچوں کے لئے سخت برتاؤ کی ضرورت ہوگی تاکہ ان کو اپنی خامیوں کا علم ہو۔ اور

بچوں کے لئے جن میں احساس کمتری موجود ہو بہت افزائی مفید ثابت ہوگی۔

فرض کیجئے کہ ایک فرد نے اپنے گھر کے اثرات کے مقابل میں وہ تمام آزادی حاصل کرلی جو اس کی اخلاقی اور نفسی ترقی کے لئے ضرور ہے اور اس قابل ہوگیا کہ زندگی میں قدم رکھے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس فرد میں اور اس کے والدین میں آئندہ کس قسم کے تعلقات ہوں۔ یہ ظاہر ہے کہ یہ تعلقات اس قدر گہرے نہ ہونا چاہئے کہ اگر کسی وجہ سے یہ باقی نہ رہیں تو جانبین اس صدمہ کے متحمل نہ ہوسکیں۔ فکر معاش اور دوسرے اس قسم کے وجوہ علٰیحدگی کے باعث ہوتے ہیں اور وہ وقت بھی لازماً آتا ہے جب موت تمام تعلقات کو ہمیشہ کے لئے قطع کردیتی ہے۔ لیکن فرض کیجئے کہ حالات ایسے ہیں کہ اس فرد کا اپنے والدین کے ساتھ زندگی بسر کرنا ممکن ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ ایک زمانۂ دراز تک والدین اور بچوں کا ساتھ جس کے لئے حیاتیاتی عذر موجود ہے، چند ایسے نفسیاتی اثرات پیدا کرتا ہے جو عمر بھر باقی رہتے ہیں۔ اور یہ بالکل فطرت انسانی کے مطابق ہوگا اگر افراد اپنی محبت کو کبھی کبھی اپنے اصلی مرکز کی طرف پلٹنے دیں۔ لیکن یہ خیال نہ کیا جائے کہ اس میلان کے اظہار میں وقت گذرنے کے ساتھ تبدیلی نہ ہوگی۔ جیسے جیسے بچے بڑے اور والدین بڈھے ہوتے جاتے ہیں۔ اول الذکر کے جسمانی اور ذہنی قوی ترقی پر ہوتے ہیں اور آخر الذکر کے مائل بہ انحطاط۔ ابتدائی زمانے میں بچے اپنے والدین کے دست نگر ہوتے ہیں، اسکے بعد انکی حیثیت مساویانہ ہوجاتی ہے۔ آخر کار وہ زمانہ آتا ہے جب معاملہ بالکل برعکس ہوجاتا ہے اور والدین اپنے بچوں سے اسی مدد کے طلبگار ہوجاتے ہیں جو انہوں نے کسی وقت ان کو دی تھی۔

یہ ایک ایسی حالت ہے جو صرف متمدن انسانوں میں پائی جاتی ہے۔ حیوان اور وحشی انسان کبرسنی کا کوئی لحاظ نہیں کرتے۔ انسان سیرت کی شاندار ترقی نے، جس میں بچوں اور والدین کے تعلقات نے نمایاں حصہ لیا ہے، اس بات کا امکان پیدا کیا ہے کہ تمام متمدن انسان اُن اشخاص کی مادی اور نفسی ضروریات کا کچھ نہ کچھ خیال کریں جو کبرسنی اور معذوری کی وجہ سے اپنی آپ مدد کرنے سے قاصر ہیں۔ بچوں کا اپنے بڈھے کمزور، اور گوشہ نشین والدین کا خیال اخلاقیات کا حسین ترین مظاہرہ ہے۔ لیکن یہاں چند اخلاقی مشکلات کا سامنا ہوتا ہے۔ بظاہر تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر بچوں نے والدین کی مدد کی تو گویا انہوں نے معاوضہ ادا کیا اُس امداد کا جو انھوں نے عہد طفلی میں حاصل کیا تھا۔ لیکن حیاتیاتی نقطۂ نظر سے ان دو صورتوں میں کوئی مشابہت نہیں۔ والدین کی اپنے بچوں کی امداد بقائے نسل کے لئے ضروری ہے۔ بڈھوں اور

معذوروں کی امداد کشمکش حیات کے لئے لازم نہیں ۔ نسل کے نقطۂ نظر سے والدین کی امداد اور محافظت کا حقیقی معاوضہ یہ ہوسکتا ہے کہ بچے خود اپنے بچوں کی امداد اور محافظت کریں ۔ بچوں اور والدین دونوں کی امداد کا بار کوئی معاشی نظام نہیں اٹھا نہیں سکتا ۔

لیکن شاذ ہی ایسا ہوتا ہے کہ بڈھے اوروں کی مادی امداد کے محتاج ہوں ۔ مہذب سوسائٹی کے بڈھے اشخاص اپنی ضروریات کی تکمیل کے لئے دوسروں کے دست نگر نہیں ہوتے خصوصاً جبکہ خود اُن کی اور عام معاشی حالت اچھی ہو ۔ گویا بڈھوں کو مادی امداد سے زیادہ نفسیاتی امداد درکار ہوتی ہے ۔ ایسی صورت میں ہمیشہ اس بات کا امکان ہونا چاہئے کہ کسی ایک گھر کے بڈھے افراد اپنے چھوٹوں کی دلچسپیوں اور خوشیوں میں آزادی کے ساتھ حصہ لے سکیں ۔ بڈھوں کی خوشی کا اس سے بہتر اور کوئی سامان نہیں ہوسکتا کہ اپنے بچوں اور بچوں کے بچوں کے کاروبار میں اپنے گذرے ہوئے زمانہ کی یاد تازہ کریں ۔ اگر کسی شخص نے اپنی گھٹتی ہوئی قوتوں اور دلچسپیوں کی یہ تلافی پالی تو سمجھنا چاہئے کہ اس کی سوانح کا آخری باب قابل رشک طریقہ پر ختم ہوا ۔ دنیا کی قدرت سے باہر ہے کہ اس سے بہتر تلافی پیش کرسکے ۔

حیات دائمی

از
جمیل احمد برنی متعلم بی اے (فائنل) جامعہ عثمانیہ

"کیوں آیا..... کیا صلح کی درخواست لے کر...... آخری تصفیہ کی امید پر..... یا موت سے ڈر کر۔ مگر یہ کسی طرح ممکن نہیں..... ڈیوک بہادر نوجوان ہے۔ آن پر جان دینے تیار رہتا ہے۔ پھر بھلا ایسی بے غیرتی کیوں کر گوارہ کرسکتا ہے"

اسی قسم کے خیالات تھے جو اس کی صورت دیکھتے ہی میرے دماغ میں پیدا ہونے شروع ہوئے۔ اسی دماغی کشمکش میں اپنی جگہ سے اٹھا اور اس سے ہاتھ ملایا کیونکہ مہمان سے کج خلقی انسانیت کی مقتضی نہیں خواہ وہ دشمن ہی کیوں نہ ہو، خیر ہم دونوں پاس پاس بیٹھ گئے۔ کچھ دیر ہمارے درمیان سکوت رہا جیسا کہ اکثر اہم اور غیر متوقع ملاقاتوں کے موقعہ پر ہوا کرتا ہے۔ آخر خود ڈیوک میری طرف مخاطب ہوا اور نہایت متانت اور سنجیدگی کے ساتھ یوں سلسلۂ کلام شروع کیا

"دیکھو تم بہادر و فیاض دشمن ہو...... ابھی نوعمر ہو۔ میں پسند نہیں کرسکتا کہ تمھیں کسی ناجائز طریقہ پر

نقصان پہچاؤں لہذا میں تم سے ایک سوال کرتا ہوں۔ سچ سچ بتاؤ کیا تم حیات دائمی کے قائل ہو؟ ڈیوک کچھ چیں بہ جبیں ہو کر کہنے لگا۔

"معلوم ہوتا ہے کہ تم اس کے قائل نہیں ہو۔ لیکن یاد رکھو جب تک میں تم سے اسکی تشریح نہ کرا لوں گا میرے لئے ناممکن ہے کہ تم سے ڈوول لڑسکوں اور جب تک لڑ نہ لونگا میری خودداری اور میری غیرت مجروح رہے گی۔

"کیوں ڈوول لڑنا اس وقت تک کیوں ناممکن ہے" میں نے کہا۔

"میں تم سے ناجائز فائدہ اٹھانا نہیں چاہتا۔ تم موت کو موت سمجھکر لڑ رہے ہو اور میں آزادی و نجات اگر میں نے تمھیں قتل کر دیا تو سمجھونگا کہ ایک روح کو آزاد کیا اور اگر تم نے مجھے قتل کر دیا تو تم خود کو اس کا مرتکب سمجھو گے۔ میں نہیں چاہتا کہ میری موت کے بعد تمھارے ضمیر پر کسی قسم کا بار رہے اور اس خیال سے کہ تم میرے قاتل ہو تمھیں صدمہ پہونچے۔ اس لئے میں تم سے صاف کہتا ہوں کہ جب تک مجھے کوئی تشفی بخش جواب نہ دو گے میں تم سے ہرگز نہ لڑوں گا...... اب بھی بتادو کیا تم حیات دائمی کے قائل ہو"

"براہ کرم آپ پہلے مجھے یہ بتا دیجے کہ آپ کو اس قسم کے سوال کا حق کیا ہے" کسی قدر تامل کے بعد میں نے جواب دیا اور ابھی کچھ اور کہنا چاہتا تھا کہ ڈیوک نے اپنے جیب سے بھرا ہوا پستول نکالا اور یہ کہتے ہوے کہ "نہ تم مجھے جواب دو گے اور نہ میں تم سے لڑونگا" چاہا کہ اپنے اوپر خالی کر دے۔

"ٹھیرو۔ ٹھیرو" یہ کہتے ہوے میں نے اسے لپک کر پکڑ لیا۔

"ڈیوک تم نے مجھے سخت مجبور کر دیا ہے۔ میرے لئے اب کوئی چارہ کار نہیں......" لیکن پھر گھبرائی ہوئی آواز میں میں نے کہا۔

"ڈیوک مجھے اس کا انتہائی افسوس ہے کہ میں نے تمھارے متعلق بالکل غلط رائے قائم کی تھی اور جیسا سمجھا تھا ویسا نہ پایا۔ تمھیں نہیں معلوم تم مجھے انتہا سے زیادہ صدمہ پہنچانے پر تلے ہوے ہو اگر میں نے قتل کر دیا تو بھی سمجھوں گا کہ میں تمھارا قاتل ہوں لیکن یہ تو نہیں کہ میں نے ہی تمھیں خودکشی پر مجبور کیا وہ بہادری ہے۔

یہ بزدلی ۔ وہ خودداری ہے یہ ظلم ۔ کیا اب بھی تم اسے جائز خیال کر سکتے ہو ۔ اگر تمھاری یہی خوشی ہے تو چلو میں قسم کھاتا ہوں کہ حیات دائمی کا قائل ہوں ۔"

" نہیں ہرگز نہیں تم جھوٹ بولتے ہو ۔"

" بیشک ۔ کسی نامعلوم قوت سے مرعوب ہو کر بلکہ مصلحتِ وقت سمجھکر ۔ کیا کروں خود تم نے مجبور کیا کہ دروغ گوئی سے کام لو .... لیکن اب میں تمھیں اس وقت تک کمرہ سے باہر نہ جانے دونگا جب تک تم اس کا وعدہ نہ کرلو کہ کل آٹھ بجے تک اپنی جان کو دوسرے کی امانت سمجھو گے اور وقت معینہ پر مجھ سے ڈول لڑنے کے لئے آجاؤ گے ۔"

ڈیوک نہایت متانت سے آرام کرسی پر سر جھکا کر بیٹھ گیا اس کی ابرو سمٹی ہوئی تھیں اور پیشانی پر شکنیں نمودار تھیں اور ان شکنوں میں پسینہ چمک رہا تھا گویا نمودار ہے تھے کہ دنیا کی کوئی طاقت اسے اپنے ارادہ سے باز نہیں رکھ سکتی ۔ اس کے عزم و استقلال کا پتہ اس کی آنکھیں دے رہی تھیں ۔ میں موقعہ کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے چندے خاموش رہا ۔ لیکن پھر ڈیوک کو مخاطب کر کے اپنا آخری فیصلہ سنانے لگا ۔

دیکھو ڈیوک ۔ میں تمھاری عزت کرتا ہوں تمھیں خوددار نوجوان بہادر سمجھتا ہوں اور کسی طرح گوارہ نہیں کر سکتا کہ تم خودکشی جیسی رکیک حرکت کا ارتکاب کرو ۔ اس وقت پانچ بجے ہیں ۔ مجھے کم از کم آج پانچ گھنٹے اور سونا چاہیئے ۔ ابھی اس کے لئے کافی عرصہ باقی ہے یعنے تقریبًا نو گھنٹے ملتے ہیں ۔ میں اپنی عزت کی قسم کھاکہتا ہوں کہ یہ نو گھنٹے تمھارے سوال کا جواب سوچنے ہی میں صرف کرونگا ۔ میں نے اپنی عمر میں کبھی نومنٹ بھی ایسے کام کے لئے صرف نہیں کئے ... یہ صرف تمھاری خاطر ہے ... لیکن اب تمھیں بھی وعدہ کرنا پڑیگا کہ کل آٹھ بجے تک تم ...... اگر میں صحیح جواب دے نہ سکا تو پھر ہم ڈول لڑیں گے اور اگر ناکام رہا تو پھر ہم دونوں اپنا خاتمہ کریں گے !

یہ سنتے ہی ڈیوک کی آنکھیں چمکنے لگیں اس نے مسکراتے ہوئے کہا ۔

دو تو گھنٹے بہت کافی ہیں میں نے خود جواب کا طریقہ سکھا دیا۔ آگے اس سے فائدہ اٹھانا خود تمھارے اختیار میں ہے مناسب ہوتا کہ تم افلاطون کے اصول ......،

'معاف کیجئے میرا مذاق فلسفیانہ نہیں ہے' میں نے کہا 'میں انگیٹھی کے پاس بیٹھ کر غور کر دنگا اس کے بعد کھانا کھاوں گا آٹھ بجے محفل رقص میں شریک ہونا ہے۔ گیارہ بجے تک وہیں رہونگا ٹھیک گیارہ بجے ایک راہب دوست سے ملنے جانا ہے اگر میری دماغی جد وجہد عالم کی بے ثباتی اور مذہب کے تقدس سے بھی یہ مسئلہ حل نہ ہوسکا تو پھر.......،

ڈلوک نے ایک ٹھنڈا سانس بھرا اور کہنے لگا۔

'غور و فکر کا اچھا طریقہ ہے۔ خیر مجھے اس سے کوئی تعلق نہیں میری دعا ہے کہ تمھیں کامیابی نصیب ہو۔ اچھا خدا حافظ ....،

یہ کہتے ہوئے ڈلوک میرے کمرہ سے باہر چلا گیا۔ میں نے خود کو اسی کرسی پر گرا دیا جس پر ڈلوک اتنی دیر سے بیٹھا ہوا تھا اور سوچنا شروع کیا۔ لیکن دماغ میں اعتراضات پیدا ہونے لگے۔ ہماری آرزو ہے کہ ہم ہمیشہ زندہ رہیں۔ دل بہلانے کے لئے خود کو خوش رکھنے کے لئے لیکن یہ عقیدہ تراشا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ ہم حقیقت سے بالکل نا آشنا ہیں۔ حیات دائمی کوئی چیز نہیں میں کیوں اتنا وقت خراب کروں۔ مجھے ڈلوک نے کس کشمکش میں مبتلا کر دیا۔ مگر نہیں مجھے ضرور سوچنا چاہئے میں نے وعدہ کیا ہے۔ لیکن۔ میری اخلاقی کمزوری ہے میں ایک فضول سی چیز پر اپنا وقت صرف کر رہا ہوں۔ ہر شخص اپنے خیال میں آزاد ہے میں کیوں اس بارے میں غور و فکر کروں ڈلوک تمھاری انانیت تمھیں مبارک ہو میں تم سے متفق نہیں ہوسکتا۔ دیکھو زندگی کے متعلق پرانی کہاوتیں، کوئی کہتا ہے کہ خواب ہے۔ سایہ ہے۔ صبح کی کہر ہے۔ گھاس کا پھول ہے۔ برف کا گالا ہے۔ اور کوئی تشبیہ دیتا ہے کہ چڑیا اندھیرے سے نکل کر ایک روشن کمرہ میں آتی ہے پھر اسی تاریکی میں گم ہو جاتی ہے کہاں سے آئی کہاں گئی کون بتا سکتا ہے کم سے کم میرے امکان سے ضرور باہر ہے...... جس طرح ایک طالب علم صبح کو ہونے والے امتحان

کی تیاری کے لئے کتاب لے کر بیٹھتا ہے مضمون مذاق کے مطابق نہیں ہوتا مگر امتحان کے ڈر سے چاروناچار اسے پڑھنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس سلسلہ میں طبیعت کی کچھ غیر موزونیت کچھ نیند کے غلبہ سے کتاب سر پر رکھ کر سو جاتا ہے۔ صبح کے گجر سے اس کی آنکھ کھلتی ہے اور گھبرا گھبرا کر کبھی کتاب کو کبھی گھڑی کو کبھی پڑے ہوئے مضمون کو اور کبھی بقیہ حصہ کے اوراق کو دیکھتا ہے۔ اسی طرح پاس کے آٹھ بجانے والے گھنٹے نے مجھے چونکا دیا۔ خود کو ویسا ہی خالی الذہن پایا جیسا کہ پہلے تھا اس کے بعد انتہائی ندامت کے ساتھ پھر غور کرنے کی کوشش کرنے لگا۔

آٹھ کا گجر ابھی ختم نہ ہوا تھا۔ گھنٹہ کی ہر ضرب مجھے کوئی بھولی ہوئی چیز یاد دلا رہی تھی ...... اخّاہ مجھے دعوت میں جانا ہے۔ آٹھ بجے کا وعدہ ہے۔ وقت ہو گیا ہے اس خیال کے ساتھ ہی میں اٹھ کر دعوت میں جانے کی تیاری کرنے لگا۔

یہ دعوت شہزادی کے یہاں تھی۔ وہ خود اس رات رقص کرنے والی تھی مخصوص محفل تھی اس لئے بہت کم لوگ مدعو کئے گئے تھے۔ میں کسی قدر دیر سے پہونچا۔ دوسرے تمام مہمان جمع ہو چکے تھے شہزادی نے اٹھ کر نہایت تپاک سے میرا خیر مقدم کیا۔ میں اس کی پاس والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ سب لوگ میرے لئے اجنبی تھے اس لئے میں نے سب کو دزدیدہ نظروں سے دیکھنا شروع کیا۔ کوئی چیز دلکش نہ تھی مگر ہاں جب میری نظریں ہر چیز کا جائزہ لیتی ہوئی شہزادی کی پاس والی کرسی تک پہونچیں تو خود بخود رک گئیں۔ غضب کی کشش تھی اور بلا کی جاذبیت نہ معلوم میں سکتہ کے عالم میں کب تک بیٹھا رہا۔ کمرہ۔ دعوت شہزادی۔ مہمان۔ رقص۔ ہر چیز فراموش ہو چکی تھی۔ مجھے کچھ یاد نہیں۔ مگر میرا یہ خواب شہزادی کی آواز سے برباد ہو گیا ہوش آنے کے بعد میں نے دیکھا وہی حسینہ شہزادی کے پاس بیٹھی ہوئی ساری محفل کی جاذب نظر بنی ہوئی ہے۔

شہزادی اس سے یوں گفتگو کر رہی تھی۔

'کیوں آپ کے والد کی طبیعت کیسی ہے وہ تشریف نہیں لائے۔

ہاں وہ نہ آسکے۔ انھوں نے معافی چاہی ہے۔ شائد کچھ دیر بعد وہ مجھے لینے آجائیں۔ وہ مجھے تنہا نہ آنے دیتے تھے۔ مگر آپ کے خیال سے ؟

' خیر شکریہ '، پھر میری طرف مخاطب ہو کر شہزادی نے کہا۔

میں آپکو اپنے معزز دوست سے ملانا چاہتی ہوں '

اس نے میرا تعارف کرایا۔ میں نے اٹھ کر ہاتھ ملایا۔ کچھ دیر بعد ہم سب اٹھ کر کھانے کے کمرہ میں چلے گئے..... موسیقی شروع ہونے سے قبل میں نے اس سے کہا۔

' کیا مجھے اس کا فخر حاصل ہو سکتا ہے کہ آج کی محفل میں آپ میری شریک رقص رہیں '

' ہاں۔ لیکن یہ پہلا موقعہ ہے کہ میں کسی کی شریک.....' اس نے کسی قدر رکتے ہوئے جواب دیا موسیقی کی دلگداز قانون کے ساتھ رقص شروع ہوا..... پھول سے زیادہ ہلکی اور ریشم سے زیادہ نرم...... میں محسوس کر رہا تھا کہ فضا میں دو روحیں پرواز کر رہی ہیں۔ جو دنیادی لطافتوں سے کہیں زیادہ نرم و نازک لطیف و پاک حسیات سے لطف اندوز ہیں.... دوران رقص میں ہماری یہی حالت رہی جسم چاہے زمین پر ہو مگر پاک روحیں ضرور عالم بالا کی سیاحت میں مصروف تھیں۔ رقص ختم ہوا۔ ہم بالکل خاموش اور بے حس کھڑے رہے ایک پروانہ شمع کے گرد پھر رہا تھا اور قریب تھا کہ خود کو ہزار جان سے بے نیازی شمع کے قربان کردے...........نے یہ منظر دیکھا نہ جانے اس پر اس وقت کس چیز کا اثر ہوا کہ بے تابانہ چلا کر کہنے لگی بچاؤ۔ بچاؤ اس غریب پروانے کو' میں نے رومال سے پکڑ کر اسے کھڑکی سے باہر پھینکدیا۔ مگر......کے چہرے پر وحشت طاری تھی۔ آنکھیں پھاڑے ہوئے۔ میری طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کا رنگ زرد پڑ گیا تھا اور بدن میں رعشہ پیدا ہو گیا تھا۔ میں نے اس سے کہا۔

' وہ زندہ ہے۔ میں نے اسے کھڑکی سے باہر پھینکدیا ہے آپ اس قدر پریشان نہ ہوا...... اور اگر بالفرض وہ جل کر راکھ بھی ہو جاتا تو کیا ہرج تھا وہ ہماری مناسبت سے دنیا میں بہت زیادہ رہ چکا ہے نہیں ہم ہمیشہ رہیں گے۔ ہماری حیات دائمی ہے۔ ہم لافانی ہیں '

نہ جانے ان الفاظ نے اس وقت مجھ پر کیا اثر کیا۔ آن کی آن میں ڈیوک۔ ڈول مسئلہ حیات وامی وغیرہ نے دماغ پر تسلط پالیا۔ کچھ دیر تک میں خاموش رہا اس کے بعد میں نے کہا۔

"اگر واقعی آپ کہتے ہیں تو میں ماننے کے لئے تیار ہوں"

"میں ہی کیا کہتی ہوں ساری دنیا کہتی ہے۔ لیکن اب مجھے رقص ختم کر دینا چاہئے۔ مجھے جلد واپس ہونا ہے۔ اچھا خدا حافظ"

یہ کہتے ہوئے وہ کمرہ سے باہر نکل گئی میں ششدر و حیران کچھ دیر وہیں کھڑا رہا۔ پھر تیزی سے قدم بڑھا کر دروازہ پر پہنچا۔ وہ گاڑی پر سوار ہو چکی تھی۔ اس کا سر ایک شخص کے بازو پر رکھا ہوا تھا۔ ملازم کے ہاتھ میں مشعل تھی اور وہ پیچھے کھڑا ہوا تھا۔ میری چکاچوند آنکھیں پہلی نظر میں اس شخص کو پہچاننے سے قاصر رہیں میں نے آنکھیں مل کر دیکھا تو صاف نظر آنے لگا۔ اُف۔ میں کیسے یقین کروں غالباً مجھے دھوکا ہو رہا تھا ڈیوک اس گاڑی میں کہاں۔ مگر وہ ڈیوک ہی معلوم ہوتا ہے۔

اس نے کہا تھا کہ میرا باپ مجھے لینے کے لئے آئے گا۔ میں سمجھ گیا اس کا باپ وہی ہے جو میرا دشمن ہے۔ یا اللہ۔ میں کیا کروں۔ کیا اب میری تمام آرزوئیں ختم ہو جائیں گی میرے لئے کیا چارہ کار ہے یا تو اس حسینہ کو حاصل کروں یا ڈیوک سے ڈول لڑوں۔ میں ان ہی خیالات میں گم نہ جانے کتنی دیر وہاں کھڑا رہا۔ ہوش آنے کے بعد میں نے شہزادی سے جانے کی اجازت حاصل کی۔ گیارہ بج چکے تھے۔ میرے دماغ میں وہی خیالات چکر کھا رہے تھے اور میں راستہ بھر اسی ڈرامہ کے متعلق سوچتا چلا گیا..... آخر اپنے دوست کے گھر پہونچا۔ یہ میرا بڑا پرانا دوست تھا۔ بچپن میں ہم مکتب رہے لیکن پھر تعلیم کی تکمیل کے بعد اس نے رُہبانیت اختیار کرلی۔ وہ اب بہت بڑا عالم مانا جاتا ہے اور میری اور اس کی زندگی میں بہت بڑا اختلاف رونما ہو گیا ہے اس پر بھی میرا دوست اسی خلوص اور محبت سے پیش آتا ہے۔

جب میں اس کے کمرہ میں داخل ہوا تو وہ کسی کتاب کے مطالعہ میں مشغول تھا اس نے مجھے اشارہ سے خاموش رہنے کے لئے کہا۔ کچھ دیر بعد کتاب بند کی اور میری طرف مخاطب ہوا۔

"کہو اتنی رات گئے کیسے ارادہ کیا"

"میں مسئلہ حیات دائمی سمجھنا چاہتا ہوں" میں نے جواب دیا۔

"تمھاری سمجھ میں نہ آسکے گا میں تمھارے مذاق سے خوب واقف ہوں"

اس کے بعد میں نے تمام واقعات جو ڈیوک کے سامنے پیش آئے تھے اس کے سامنے بیان کیے اور نہایت بیکسی کے انداز میں یہ کہہ کر چپ ہو گیا۔

"سوائے تمھارے میری مدد کرنے والا کوئی نہیں۔ تم نے ہمیشہ میری مدد کی ہے۔ اب میں کہاں جاؤں"

"خیر اتفاق سے میں اس وقت اسی مسئلہ کا مطالعہ کر رہا تھا۔ مگر میں تمھاری طبیعت سے خوب واقف ہوں تم اس وقت تک کسی چیز کا یقین نہیں کرتے جب تک کہ تمھارے تجربہ میں نہیں آجاتی تمھیں علم پر نہیں تجربہ پر زیادہ اعتقاد ہے"

"اس کے لئے کیا تجربہ ممکن ہے۔ جب میری عقل ہی وہاں تک رسائی نہیں کر سکتی۔۔۔۔۔"

"لیکن۔ تم پہلے مجھے یہ بتاؤ کہ کیا دنیا میں کوئی ایسی بھی ہستی ہے جس کے تم دیوانے ہو۔۔۔۔۔ اور جس کو تم دل و جان سے عزیز رکھتے ہو۔۔۔۔۔" میرے دوست نے کہا۔

"لیکن اس کا یہاں کیا ذکر۔۔۔۔۔"

"تجربہ کا صرف ایک طریقہ ممکن ہے۔ لیکن وہ خطرناک ہے، کیا تم اپنی جان خطرہ میں ڈالنے کے لئے تیار ہو۔۔۔۔۔"

"مجھے کسی خطرہ کی پروا نہیں۔ موت سے میں بالکل نہیں ڈرتا۔ لیکن میں اپنے وعدہ کے مطابق مجبور ہوں کہ اپنی جان کی کل تک معقول حفاظت کروں۔۔۔۔۔"

"اچھا اگر تم میری ہدایتوں کے مطابق کام کرنے کو تیار ہو تو میں تمھاری جان کا ذمہ لیتا ہوں، دیکھو تمھاری خاطر میں خود کو خطرہ کی نذر کر رہا ہوں۔ اگر یہ بات پھوٹ گئی تو مجھے بڑی سخت

مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔

میں ہر ممکنہ کوشش سے تمھاری ہدایت کے مطابق عمل کرونگا،

اس نے مجھے ایک سیاہ لباس پہنا دیا اور کہا کہ قبل اس کے کہ ہم یہاں سے قدم اٹھائیں اپنے دل سے قسم کھاؤ کہ جو واقعات پیش آئیں گے تم ان کی مخالفت نہ کروگے۔ اس کے علاوہ ان لوگوں کے نام جن کے پاس میں تمھیں بھیج رہا ہوں کسی پر ظاہر نہ کروگے۔ اس قسم کے رازوں کا انکشاف بہت خوفناک ہوتا ہے میں نے قسم کھالی۔

میرے دوست نے گھڑی پر نظر ڈالی اور کہا" اب ایک لمحہ بھی ضایع نہ کرنا چاہیے۔ میں تم سے امید کرتا ہوں کہ اپنا وعدہ نہ بھولو گے۔ دیکھو میں تمھارا انتظار کرتا رہوں گا۔ جاؤ"۔ اس نے پھر میرے کان میں جھک کر کہا" خبردار وہاں کی کوئی چیز نہ کھانا"۔

اس کے بعد وہ مجھے زینہ تک پہونچانے کے لئے آیا۔ ہر طرف گورستانی سکوت اور تاریکی چھائی ہوئی تھی ہوا کے سرد تھپیڑے میرے رونگٹے کھڑے کئے دیتے تھے۔ میں دو ہی قدم چلا تھا کہ کسی نامعلوم طاقت نے مجھے دبوچ لیا۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ وہ کتنے آدمی تھے جن کے مضبوط ہاتھوں نے مجھے اٹھا لیا تھا میں نے محسوس کیا کہ وہ مجھے کہیں لئے جا رہے ہیں۔ کچھ دیر بعد انھوں نے مجھے کسی سخت چیز پر رکھدیا یہ چیز مجھے ہلتی ہوئی معلوم ہوئی۔ پھر گاڑی کے پہیوں کی گڑگڑاہٹ کی آواز سنائی دی۔ میں سمجھ گیا کہ میں گاڑی میں ہوں گاڑی کسی طرف جا رہی ہے۔ آخر گاڑی رکی۔ ان مضبوط ہاتھوں نے مجھے پھر اٹھا لیا۔ اب مجھے گرمی محسوس ہو رہی تھی غالباً یہ مکان میں داخل ہو چکے تھے۔ دور سے پیانو کی دلکش آواز دھیمی ہوتی جا رہی تھی میں اس سے دور ہوتا جا رہا تھا۔ انھوں نے میری آنکھوں کی پٹی کھولدی اور نہایت بے دردی سے مجھے ایک طرف جھٹکدیا میرا دماغ چکر کھا رہا تھا۔ آنکھیں چکا چوند ہو گئی تھیں۔ اس لئے میں کچھ نہ دیکھ سکا کچھ دیر بعد میں نے خود کو ایک کمرہ میں پایا۔ کمرہ میں سرخ روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ اور ایک پیانو وہاں رکھا ہوا تھا۔ صوفہ پر ایک کتاب پڑی ہوئی تھی۔ میں دیر تک اپنی جگہ سے

نہ اٹھا۔ آخر صوفہ پر لیٹ گیا اور کتاب اٹھاکر دیکھنے لگا۔ مگر مضمون کا سلسلہ نہ ملتا تھا کیوں کہ اکثر ورق نکال لئے گئے تھے۔

اچانک ایک دوسرے قسم کی روشنی مجھے معلوم ہوئی۔ انتہائی خوف مجھ پر طاری ہوگیا دوڑکر کھڑکی کے پاس پہونچا۔ اس کے ہاتھ لگاتے ہی بٹاقہ کی آواز سنائی دی اور کھڑکی کھل گئی۔ نیچے ایک سیاہ پوش شخص دکھائی دیا جو ایک میز پر سر جھکائے ہوئے تھا میں دوڑتا ہوا اپنی جگہ واپس آگیا۔

'آدھ گھنٹہ میں' مجھے کسی مرد کی آواز سنائی دی

وہاں آدھ گھنٹہ میں' یہ کسی عورت کی باریک آواز تھی۔

کچھ دیر کے بعد دروازہ کا قفل کھولنے کی آواز سنائی دی۔ دروازہ کھلا اور ایک عورت اندر داخل ہوئی اور میرے سامنے آکر جھک گئی۔ میں پریشان تھا کہ یہ معاملہ کیا ہے۔ اس حرکت سے تو یہ اندازہ ہوتا تھا کہ وہ مجھے پادری سمجھ کر اعتراف کے لئے جھک رہی ہے۔ میں دو قدم پیچھے ہٹ گیا اور اس نے نظر اٹھاکر میری طرف دیکھنا شروع کیا۔

'میں قریب المرگ ہوں' اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔'

'کیا مرنے والوں کی یہی صورت اور یہی رنگ ہوا کرتا ہے' میں نے دریافت کیا۔

'یقین جانیے میں صرف چند گھنٹوں کی مہمان ہوں۔ مجھے سورج کی روشنی بھی دیکھنی نصیب نہ ہوگی'، یہ جملہ اس نے انتہائی درد بھرے لہجہ میں کہا۔ اور میرے اوپر اس قدر اثر ہوا کہ میں قریب تھا کہ چکراکر گر جاتا مگر سنبھل گیا۔

'کیوں آپ کی طبیعت کچھ خراب معلوم ہوتی ہے' اس نے کہا۔

'ہاں کچھ خراب ہے'، میں نے جواب دیا۔ وہ اس وقت مجھے بغور دیکھ رہی تھی اور کچھ دیر اسی طرح دیکھتی رہی اس کے بعد ادب سے کہنے لگی۔

'میں نے آپکو بہت تکلیف دی۔ یہ ہرگز مناسب نہ تھا کہ آپ ایسی وحشتناک رات میں یہاں

تشریف لاتے مجھے آپ کی علالت کا قطعی علم تھا اور نہ میں راہب کو بلانے کے لئے اپنے والد سے ہرگز نہ کہتی .... مجھے یاد پڑتا ہے میں نے آپ کو کہیں دیکھا ہے۔آپ، مجھے اجنبی معلوم نہیں ہوتے ..... اگر آپ کو یاد ہو تو بتائیے ...... میرا دماغ اس وقت بالکل کام نہیں کر رہا ہے ....

' میں آپ کی خدمت کے لئے ہر طرح تیار ہوں ۔میرے آرام و تکلیف کا کوئی خیال نہ فرمائیے ..... میں نے کہا کچھ دیر وہ خاموش رہی اس کے بعد صوفہ کے پاس کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئی اور رُک رُک کر یوں کہنا شروع کیا ۔

' میں آپ کو زیادہ دیر تک پریشان نہ رکھونگی ۔مجھے آپ پر اعتماد ہے اور میرا جی چاہتا ہے کہ سب کچھ آپ کے سامنے بیان کر دوں ۔مگر اس خیال سے میری روح کانپ جاتی ہے ۔ہم پر شیطان مسلط ہے ۔اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا منہ چھپا لیا ...... میری سمجھ میں نہیں آتا کیسے بیان کروں ...... خیر ..... ہاں چند گھڑیاں میری زندگی کی خوشگوار گھڑیاں تھیں ۔مجھے آج تک اتنی مسرت حاصل نہیں ہوئی تھی میں نے آج تک کسی کے ساتھ رقص نہ کیا تھا ۔وہ پروانہ شمع پر فدا ہو کر جل جانے والا پروانہ ۔ اس نے بچالیا ...... اس کا کہنا ..... کیا ہرج ہے اگر وہ جل کر مرجاتا ۔ہم بھی تو اسی کے مانند ہیں ..... بس اب کچھ نہیں .... ہاں ابھی کچھ اور کہنا ہے ۔خوب یاد آیا ۔اس نے یہ بھی کہا تھا ..... اگر آپ کہتی ہیں تو میں ماننے کیلئے تیار ہوں ...... لیکن میں اس سے کچھ نہ کہہ سکی ..... اگر میں آپ سے کہدوں تو آپ میری جانب سے اس سے کہدیں گے ...... ہرگز نہیں آپ کو ہرگز نہ کہنا چاہئے ۔ہاں آپ اپنی طرف سے کہہ سکتے ہیں ......'

یہ کہہ کر اس نے اپنا سر جھکا لیا ۔بغور نیچے دیکھ رہی تھی اور اس کی آنکھوں میں مسرت و تعجب کی لہریں دوڑ رہی تھیں ۔میں اس کی طرف مخاطب ہوا ۔قبل اس کے کہ زبان کشائی کا موقعہ ملے ۔ڈیوک کمرہ میں آگیا ۔اس لڑکی نے اس کے طرف مخاطب ہو کر کہا ۔

' آپ بیمار ہیں '

"میں آپ کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔ اور تکلیف دہی کی معافی چاہتا ہوں لیکن مجھے امید ہے کہ آپ میرے ساتھ کچھ شراب ضرور نوش فرمائیں گے تاکہ کسل دور ہو جائے۔

میں وہاں سے اٹھ کر ڈیوک کے پیچھے پیچھے چلا اور اندھیرے کمروں میں سے گذرتا ہوا ایک بڑے ہال میں داخل ہوا۔ ڈیوک کے ہاتھ میں لیمپ تھا اور میری نظروں کے سامنے وہ وحشتناک منظر جس کے بیان سے بھی روح کانپتی ہے۔ زینہ کی دیواروں اور کھمبوں پر خوفناک تصویریں آویزاں تھیں۔ کچھ نئی قسم کے جانوروں کی جو آدھے انسان معلوم ہو رہے تھے۔ اور آدھے حیوان۔ دو بڑے سروالے انسانوں کی جن میں ایک مرد تھا اور ایک عورت۔ کچھ پھلوں اور پھولوں کی۔ ان کے درمیان اُلوؤں اور بندروں کی غرض یہی منظر دیکھتے ہوئے میں ڈیوک کے ہمراہ بڑے ہال میں داخل ہوا۔ ڈیوک مُہر بہ لب ایک صوفہ پر بیٹھ گیا۔ میں بھی اسی کی طرح خاموش رہا۔ آخر خود ڈیوک میری طرف مخاطب ہو کر بولا

"تم نے دنیا میں بہت سی عجیب چیزیں دیکھی ہونگی۔ لیکن تم نے کسی مکان کو اس طرح بھی سجا ہوا دیکھا ہے"

"کبھی نہیں۔" میں نے جواب دیا "

"لیکن کیا یہ کسی انسان کے افکار کا نتیجہ ہو سکتا ہے۔"

"ہاں ایک شاعر کے"

"لیکن میرے خاندان میں کوئی شاعر نہیں گزرا" پھر ایک تصویر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "اس کی ایجاد کا سہرا موجودہ مالک مکان کے باپ کے سر ہے"

اس کے بعد اس نے قریب کے پردہ کی ریشمی ڈوریاں کھینچیں۔ تمام کمرہ یکدفعہ نور ہو گیا۔ گلابوں اور اناروں دوسرے پھل پھولوں اور تصویروں سے روشنی نکلنے لگی۔ میں حیران ہو کر کچھ دیر ان چیزوں کو دیکھتا رہا اس کے بعد کہنے لگا۔

"اس مکان کا موجودہ مالک کون ہے"

"یہ سنتے ہی اس کے چہرہ کا رنگ بدلنے لگا۔ اور اپنی لڑکی کی طرف دیکھا جو انگیٹھی کے پاس صوفہ پر

بیٹھی ہوئی تھی۔ اور اس طرف متوجہ نہ تھی۔ اس نے دبی ہوئی آواز میں مجھ سے کہنا شروع کیا۔

"موجودہ مالک مکان کے صرف ایک لڑکی ہے۔ جس کے شباب کا پھول ابھی نورس ہے۔ وہ اپنے آباو اجداد کی بدقسمتی اور خوفناک انجام سے واقف نہیں۔ صرف اسے اسی قدر اطلاع دی گئی ہے کہ وہ اپنی عمر کے سترویں سال زندگی کی دوسری ہئیت میں داخل ہوگی۔ اسے کسی قسم کا خوف نہیں وہ اپنی ماں کے پاس جانے کے لئے ہر دم تیار ہے۔ وہ شخص جو اس سے سب سے زیادہ محبت کرتا ہے اور اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز رکھتا ہے خود چاہتا ہے کہ وہ اس دنیا سے جو دوزخ ہے کسی دوسری دنیا میں بھیجدی جائے۔

"وہ شخص بالکل دیوانہ ہے جس کا یہ خیال ہے" میں بیساختہ کہہ اٹھا۔ ڈیوک نے مجھے گھور کر دیکھا۔ میں سمجھا کہ اس نے مجھے یقیناً پہچان لیا۔ ابھی میں کچھ کہنا چاہتا تھا وہ خود کہنے لگا۔

"وہاں ان لوگوں کے نزدیک دیوانہ ہوسکتا ہے جو معاملہ سے واقف نہیں۔ پانچ پشتیں اسی عذاب میں مبتلا رہ چکی ہیں۔ کیا چھٹی بھی رہے نہیں ہرگز نہیں"۔

یہ کہہ کر وہ لڑکی کی طرف بڑھا۔ لڑکی کا چہرہ سنگ مرمر کی طرح سفید پڑ گیا۔ میں نے خیال کیا کہ وہ بیہوش ہونے کے قریب ہے۔ شراب جو میز پر رکھی ہوئی تھی گلاس میں انڈیل کر اسے پلانے کے ارادہ سے بڑھا مگر اس نے گلاس واپس کرتے ہوے کہا۔

"نہیں تم تھک گئے ہو۔ تمھیں اس کی ضرورت ہے تم ہی پی لو"۔

میں پینے کے قریب تھا کہ میرے دوست کی نصیحت یاد آگئی "وہاں کی کوئی چیز بھی نہ چکھنا" میں اسوقت ہوش ہی میں تھا جب ڈیوک نے کنٹرے سے دوا نکال کر اپنے رومال پر چھڑکی اور اسے لڑکی کو سونگھادی۔ وہ صوفہ پر گر گئی۔ مجھے یاد ہے اس وقت میرے منہ سے بے اختیار چیخ نکل گئی ہر طرف اندھیرا چھا گیا تھا میں نے لڑکی کو ڈھونڈنے کے لئے ہر طرف ہاتھ پیر مارے لیکن کچھ نہ پاسکا آخر میرے پیر بہت بری طرح لڑکھڑائے اور مجھے معلوم ہوا کہ جیسے میں کسی گہرے سمندر میں ڈوبتا جا رہا ہوں۔ اس کے بعد مجھے کچھ خبر نہیں۔

جب آنکھ کھلی تو خود کو اپنے دوس[illegible]لا تھا۔ ہوش وحواس میں تھا۔ لیکن وہ

UNIVERS

شعلۂ رنگیں۔ وہ حسن و شباب کا پیکر۔ اب کہاں۔ وہ ہمیشہ کے لئے بیہوش ہو چکی تھی اس پر عالم خواب جس کی صبح معلوم نہیں ہے بھی یا نہیں...... وہ ختم نہ ہونے والے خواب کی دنیا میں پہنچ گئی اور میری زندگی کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے تاریک۔ مایوس اور افسردہ کر گئی۔

(ترجمہ)

بیجوں اور پھلوں کا انتشار

از
محمد ریاض الحسین متعلم سال دوم

اپنی نسل کی بقا اور ترقی کا احساس نہ صرف انسان ہی میں پایا جاتا ہے بلکہ جمیع حیوانات اور نباتات بھی اس احساس سے خالی نہیں۔ ہر ایک جاندار شے کی یہی خواہش ہوتی ہے کہ کسی طرح اس کی اولاد اس دنیا میں برقرار رہے اور اس کا سلسلہ نسل و تناسل باوجود مختلف قسم کی مخالفت اور تباہ کن قوتوں کے مقابلہ کے جاری رہے۔ اکثر و بیشتر پودے اپنی زندگی کے ایک خاص حصے میں کثرت سے بیج پیدا کرتے ہیں جن میں سے چند بیج ضائع ہو جاتے ہیں اور چند درختوں کی شکل میں نمودار ہوتے ہیں اور ان پودوں کی نسل کو آگے بڑھاتے ہیں۔ بعض درختوں کی شاخیں کاٹ دی جاتی ہیں تو ان میں از سر نو شاخیں پھوٹتی ہیں اور اس طرح وہ نیا جنم حاصل کرتے ہیں اور ان کا سلسلہ نسل مٹنے نہیں پاتا۔ بعض درختوں کی قلمیں لگائی جاتی ہیں اور یہ قلمیں جڑ پکڑ کر تناور درخت بن جاتی ہیں اور اس طرح ان کا سلسلہ بھی مٹنے نہیں پاتا۔

جس طرح انسانوں کی افزائش نسل میں تبدیل مقام اور نئی آب و ہوا سے بڑی مدد ملتی ہے اسی طرح پودوں کے لئے بھی یہ ضروری ہے کہ ان کے بیج ایک ہی جگہ جمع نہ ہو جائیں بلکہ ان کا دور فاصلوں پر منتقل ہونا

اور موزوں مقامات پر پہنچنا ان کی افزائش نسل کا باعث ہوتا ہے اگر کسی درخت کے کل بیج ایک جگہ گر جائیں تو یقین ہے کہ انہیں سے ۹۰ فی صدی ضائع ہو جائیں گے اور جس طرح جگہ کی تنگی انسانوں میں مختلف امراض پیدا کرکے ان کو کمزور اور تباہ کر دیتی ہے اسی طرح اگر کسی پر کھا پودے کے بیج اس کے نیچے ہی گر پڑیں تو بیجوں کی ایک ہی جگہ اتنی کثرت ان کے اگنے، بڑھنے اور پھلنے پھولنے میں مانع ہوگی۔ وہاں انھیں نہ کافی روشنی ملے گی اور نہ پانی اور ہوا بھی خاطرخواہ طور پر حاصل ہو سکے گی۔ چونکہ پر کھا پودے نے اس زمین کا غذائی مادہ صرف کرلیا ہوگا۔ اس طرح کم زرخیز زمین میں بہت سارے پودوں کے اگنے سے ان میں ڈارون کے خیال کے مطابق تنازع للبقاء پیدا ہوتا ہے یعنی طاقتور پودے کمزور پودوں کو تباہ کر کے خود ان کی جگہ پر قابض ہو جاتے ہیں اس کا مشاہدہ اس طرح کیا جا سکتا ہے کہ اگر ایک جنگل کا کچھ حصہ محصور کر کے اس حصہ کے جملہ درختوں کا شمار کریں اور چند سال بعد اس حصہ کا معائنہ کریں تو معلوم ہوگا کہ کمزور درختوں کی جگہ طاقتور درختوں نے لے لی ہے۔

پودے اپنے بیجوں کو ناموافق حالت سے بچانے کے لئے جس قدر دور ممکن ہو انھیں منتشر کرتے ہیں اور یہ انتشار بالعموم مندرجہ ذیل ذرائع سے عمل میں آتا ہے۔

۱) ہوا

۲) پانی

۳) حیوانات

۴) دھماکو یا پھینک ہئیتیں جو پھلوں میں ہوتی ہیں۔

۵) اتفاقی انتشار

۱) ہوا کے ذریعہ انتشار۔

ہوا کے ذریعہ انتشار صرف ان ہی درختوں میں عمل میں آتا ہے جن کے بیج ہلکے اور چھوٹے ہوتے ہیں یہ بیج اس قدر چھوٹے ہوتے ہیں کہ جب وہ پھل سے آزاد ہوتے ہیں تو ہوا انھیں اڑا لیجاتی ہے۔ آرکڈز کے

بیج اس قدر ہلکے ہوتے ہیں کہ ننگی آنکھوں سے اس کا مشاہدہ ممکن نہیں ۔ یہ بیج ذرا سی ہوا سے بہت دور پہنچ جاتے ہیں ۔ خرفہ کے بیج بھی اسی قسم کے ہیں ۔ گاجر کے بیج چپٹے ہوتے ہیں جو بآسانی اُڑ سکتے ہیں ۔ بیج چھوٹے ہوتے ہیں تو معمولی ہوا سے اڑ سکتے ہیں لیکن جب بڑے ہوتے ہیں تو ان کے بے گھر کرنے کے لئے تیز ہوا کی ضرورت ہوتی ہے ۔

CENSER MECHANISMS کے ذریعہ بھی انتشار ایک دلچسپ طریقہ سے عمل میں آتا ہے ۔ جب بیج وزنی ہوتے ہیں تو ان کا انتشار مندرجہ بالا طریقہ سے وقوع میں آتا ہے ۔ ہوا تیز چلتی ہے تو پھل کھلتا ہے اور ہوا ان کو اڑا لیجاتی ہے اس طریقہ میں یہ ہوتا ہے کہ پھل اوپر کے حصہ سے پھٹ جاتا ہے لیکن نچلا حصہ اسی طرح لگا رہتا ہے جس کی وجہ سے وہ ایک جھنکیے CENSER کی شکل اختیار کر لیتا ہے ۔ ہوا کے جھونکوں کے ساتھ کیسہ ہلتا ہے اور بیج تھوڑی تھوڑی مقدار میں خارج ہو کر منتشر ہوتے رہتے ہیں ۔ بطخ کی بیل ARISTOLOCHIA اس کی ایک دلچسپ مثال ہے ۔ اس کا کیسہ راسی جانب تو لگا رہتا ہے ۔ لیکن نچلا حصہ پھٹتا ہے ہوا کے جھونکوں سے ہل کر وقتاً فوقتاً تھوڑے تھوڑے بیج آزاد ہو جاتے ہیں چونکہ یہ بیج چپٹے ہوتے ہیں اس لئے ہوا میں منتشر ہو جاتے ہیں ۔ پیلے دھتورے کا کیسہ راسی جانب شگفتہ ہوتا ہے اور خشخاش کے راسی حصے میں سوراخ ہوتے ہیں ان دونوں کی پھلداریاں لانبی ہوتی ہیں کیسہ ہوا سے متاثر ہو کر تھوڑے تھوڑے بیج آزاد کرتا ہے سورج مکھی کی پھلداری ہوا سے ہلنے لگتی ہے اور پولیے آزاد ہوتے ہیں ۔

PARACHUTE MECHANISMS انتشار کا ایک اور دلچسپ طریقہ ہے پھل اور بیج بعض مخصوص پردار یا بالدار زائدے تیار کرتے ہیں جس کی وجہ سے وہ مجموعی طور پر ہلکے ہو جاتے ہیں اور ہوا میں بہ آسانی اڑنے لگتے اور منتشر ہو جاتے ہیں مثلاً آگ کے بیجوں کے راسی پر بالوں کا گچھا ہوتا ہے ۔ کپاس کے بیج ایک ریشہ دار زائدے میں ڈھکے رہتے ہیں یہی روئی ہے ۔ بعض پھل اور بیج پردار ساختیں تیار کرتے ہیں اس کی مثالیں ہم کو سوزنی کے بیجوں میں ملتی ہے ۔ جب اس کی پھلی پختہ ہو کر پھٹتی ہے تو بیج آزاد ہو جاتے ہیں چونکہ ان کے اطراف پردار ساخت ہوتی ہے اس لئے ہوا ان کو اڑا لیجاتی ہے ۔ پردار پھلوں کی مثال ہم کو

گاتر و کاریس میں ملتی ہے۔ سرشت کے پھلیاں ہلکی ہوتی ہیں اس لئے اڑسکتی ہیں۔ اس کا مشاہدہ بارش سے قبل تند ہوا چلتے وقت ہوسکتا ہے۔ اس زمانے میں ہزارہا پھلیاں کس مپرسی کی حالت میں فرش زمین پر پڑی رہتی ہیں۔

ہوا کے ذریعہ بیجوں کے منتشر ہونے میں بے شمار بیج ضائع ہوجاتے ہیں کیونکہ ہوا کسی خاص سمت میں نہیں چلتی اور بیج ہر قسم کی زمین خواہ بنجر ہو یا زرخیز دریا ہو یا سمندر میں جاگرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ایسے بیج جو ہوا کے ذریعہ منتشر ہوتے ہیں، بہت زیادہ مقدار میں تیار ہوتے ہیں تاکہ اس نقصان کی تلافی ہوسکے۔ اس قسم کے انتشار میں زیادہ تر بیج کی قسمت پر دارومدار ہے کیونکہ ایک بیج کو زمین زرخیز ملتی ہے دوسرے کو بنجر۔

۲) پانی کے ذریعہ انتشار۔

اس قسم کا انتشار زیادہ عام نہیں صرف آبی پودوں میں عمل میں آتا ہے۔ آبی پودوں کے بیج پانی کے اندر ہی تیار ہوکر منتشر ہوتے ہیں مثلاً سنگھاڑا میں۔ بعض بیج اسفنجی یا ریشی پوست سے ڈھکے رہتے ہیں اور ان میں ہوا بھری رہتی ہے تاکہ وہ پانی سے ہلکے ہوجائیں اور ڈوبنے نہ پائیں ان کے بیرونی حصے پر ایک موم کا پوست بھی ہوتا ہے تاکہ وہ پانی سے سڑکر خراب نہ ہوجائیں۔ کنول کے بیجوں کا انتشار بھی پانی کے ذریعے عمل میں آتا ہے ساحلوں پر ناریل کے درختوں کے جھنڈ نظر آتے ہیں یہ آبی انتشار کا نتیجہ ہیں۔ ناریل کے پھل کا ایک حصہ ریشہ دار ہوتا ہے جس کی وجہ سے پھل مجموعی طور پر ہلکا ہوجاتا ہے اور پانی پر تیرتے ہوے ایک جگہ سے دوسری جگہ جاپہنچتا ہے۔ اس پھل کا بیرونی غلاف آب بند ہوتا ہے جو پانی کو اندر گزرنے میں مانع ہوتا ہے اس کے علاوہ بالکل بیرونی حصہ پر موم کا پوست چڑھا ہوتا ہے اس لئے اس پر پانی عمل کرکے اس کو سڑنے نہیں دیتا۔ چنانچہ ناریل جب درخت سے سمندر میں گرتا ہے تو کئی ہفتوں تک سمندر پر تیر سکتا ہے بعض اوقات تو ایک سمندر سے دوسرے سمندر کو سینکڑوں میل کا سفر طے کرکے یہ سفینہ کنارے سے جا لگتا ہے اور درخت پیدا کرتا ہے۔

سنگھاڑے کے دونوں جانب دو نوکدار زائدے ہوتے ہیں اس کا مصرف یہ ہے کہ جب اس آبی پودے کے بیج پختہ ہو جاتے ہیں تو یہ اس زائدے کے رخ پر زمین پر گرتا ہے اور اسی طرح زمین میں داخل ہو کر پودا پیدا کرتا ہے ۔

۳) حیوانات کے ذریعہ انتشار

یہ طریقہ انتشار ابتدائی دونوں طریقوں سے مشکل ہے کیونکہ اس میں درختوں کو جانوروں کے راغب کرنے کا فعل بھی انجام دینا پڑتا ہے جس کی پہلی دو صورتوں میں ضرورت نہیں پڑتی ۔ ہوا چلتی رہتی ہے اور پانی بہتا رہتا ہے انتشار ضمنی طور پر عمل میں آتا ہے ۔ پھلوں اور بیجوں کا انتشار حیوانات کے ذریعہ دو طریقوں سے عمل میں آتا ہے :-

ا) حیوانات بخوشی انتشار میں مدد دیتے ہیں ۔

ب) حیوانات انتشار کرنے کے لئے مجبور کئے جاتے ہیں ۔

پہلے طریقہ میں درخت حیوانات کو انتشار کا فعل انجام دینے کے لئے راغب کرتے ہیں ایسی صورت میں پھل ماسی یا خوش نما ہو جاتے ہیں حیوانات ان کو کھانے کے لئے آتے ہیں اور بیج سخت خولوں میں محفوظ رہتے ہیں مثلاً آم ۔ آم کا بیرونی حصہ ابتدا میں ہرا اور پکنے پر زرد ہو جاتا ہے یہ جانوروں کو اپنی طرف راغب کرتا ہے اور ماسی حصہ رشوت کا فعل انجام دیتا ہے اور وہ حصہ جس کے اندر بیج ہوتا ہے سخت ہوتا ہے اس طرح جانور ماسی حصہ کی خاطر انتشار کا فعل انجام دیتے ہیں بعض جانور پھلوں کو معہ بیجوں کے کھا لیتے ہیں بیج چونکہ سخت پوست سے ڈھکے رہتے ہیں اس لئے ہضم نہیں ہوتے اور فضلہ میں جوں کے توں نکل آتے ہیں ۔ اور منتشر ہوتے ہیں اس قسم کی مثالیں سیتا پھل ۔ بیر بیگن ۔ نیم اور املتاس وغیرہ میں ملتی ہیں ۔ چنانچہ سیتا پھل اور املتاس کے درخت اکثر دور دراز مقامات اور پہاڑوں پر نظر آتے ہیں یہ کولوں وغیرہ ہی کی کارگزاری ہے جو ان بیجوں کو وہاں تک پہنچاتے ہیں ۔

بعض اوقات ہم کو درختوں پر دوسرے قسم کے پودے یا بیل نظر آتے ہیں اس کی عام مثال قرضدار

کی بیل ہے جو نیم کے درخت پر ہوتی ہے قرضدار کی بیل کے بیج پرندوں کی چونچ سے چمٹ جاتے ہیں کیونکہ ان کا رس لسّرج ہوتا ہے۔ ان بیجوں سے پرندے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے درختوں پر چونچ رگڑتے ہیں وہ بیج ان درختوں کو چمٹ جاتے ہیں اور ان پر اگتے ہیں۔

بعض بیج کیڑوں کی شکل اختیار کر لیتے ہیں پرندے دھوکے سے انہیں کیڑے سمجھ کر اٹھا لیجاتے ہیں لیکن اپنی غلطی پر نادم ہو کر پھینک دیتے ہیں اس قسم کی مثالیں ہم کو ارنڈی اور گھچی میں ملتی ہیں۔ ارنڈی کے بیج پر اس قسم کے نشانات ہوتے ہیں کہ کیڑے ہی کا شبہ ہوتا ہے۔

بعض بیج جب تک حیوانات کے معدہ میں سے نہیں گزرتے اُگنے کے قابل نہیں ہوتے پرندے ان کے ماسی حصوں کو کھا لیتے ہیں اور اسی طرح وہ بیج معدہ میں سے گزر جاتے ہیں۔ چنانچہ کیکر کا بیج جب بکری کے معدے میں سے گزر جاتا ہے تو وہ جلد اُگ جاتا ہے اس قسم کے بیجوں کے غلاف سخت ہوتے ہیں اسی لئے حیوانات ان کو ہضم نہیں کر سکتے۔

بعض پودے ایسے بھی ملتے ہیں جو گلہری وغیرہ سے کوسوں دور رہنا چاہتے ہیں قدرت نے بھی ان کی خواہش کو عملی جامہ پہنایا وہ اس طرح سے کہ جب اس قسم کے پھل درخت پر ہوتے ہیں تو ہرے اور زمین پر گرنے پر ان کا رنگ بھورا ہو جاتا ہے اس قسم کے پھلوں کی مثالیں ہم کو اخروٹ بادام وغیرہ میں ملتی ہیں جس کے تخم سخت چوبی غلاف میں محفوظ رہتے ہیں۔

ب) دوسرا طریقہ وہ ہے جس میں حیوانات کو بیجوں کے انتشار کے لئے مجبور کیا جاتا ہے۔ ان بیجوں یا پھلوں میں آنکڑوں کے شوکوں یا اس قسم کے چمٹنے والے اعضاء پائے جاتے ہیں جن کی وجہ سے اس قسم کے پھل یا بیج جانوروں یا پرندوں وغیرہ کے پیروں یا جسم وغیرہ سے چمٹ جاتے ہیں اور اس طرح انتشار عمل میں آتا ہے۔ اس کی مثالیں ہم کو گوکرو۔ کتتے وغیرہ میں ملتی ہیں۔ کتتے کی پھلداری نیچے کی جانب رُخ کئے ہوئے رہتی ہے جانوروں کے بالوں یا آدمیوں کے لباس سے چمٹ جاتی ہیں۔ گوکرو کے شوکے رہروں کے پیروں میں چبھ جاتے ہیں جنھیں نکال کر وہ دور پھینک دیتے ہیں۔ اسی طریقے سے جنگلی بوٹیوں کے

کئی ایک قسم کے بیج منتشر ہوتے ہیں۔

بعض آبی پودوں میں بیج اس کثرت سے ہوتے ہیں کہ پانی پر ان کے چھوٹے چھوٹے جمگھٹے بن جاتے ہیں اور جب آبی پرندے غذا کی تلاش میں پانی پر تیرتے رہتے ہیں تو یہ ان کے پر وغیرہ سے چپاں ہوجاتے ہیں چنانچہ اس طرح سے بھی تخم ایک مقام سے دوسرے مقام کو منتقل کئے جاتے ہیں۔

۴) پھلوں میں دھماکو یا پھینک منتشر ہیں۔

اس طریقہ انتشار میں کوئی بیرونی ذرائع سے مدد نہیں لیجاتی بلکہ پھل پختہ ہونے کے بعد خود بخود یا بیرونی محرکوں کے اثر سے پھٹ پڑتے ہیں اور بیجوں کو دور دور پھینک دیتے ہیں اس عمل کو پھینک منتشیت کہتے ہیں

گل مہندی کے پختہ کیسے کو اگر دھکا دیا جائے تو وہ طولی شگاف سے پھٹ پڑتا ہے اور بیج دور فاصلہ پر جا گرتے ہیں۔ اس قسم کی ایک اور مثال ہم کو جزائر غرب الہند کے ایک درخت میں جو سینڈ باکس کہلاتا ہے ملتی ہے اس کے بیجوں کی تھیلی پھٹتے وقت پستول کی سی آواز آتی ہے اور اسکے بیج دور دراز پھیلتے ہیں بیج اس قدر دھماکہ اور تیزی کے ساتھ نکلتے ہیں کہ اگر کوئی درخت کے قریب ہو تو وہ زخمی ہوجاتا ہے

امبوتی کے بیج ارل دار ہوتے ہیں۔ ان کا ارل نہایت ہی لچکدار ہوتا ہے۔ اس کے پختہ کیسہ کو چھیڑتے ہی ارل نہایت ہی سرعت سے اندر کی طرف مڑجاتا ہے اس طرح بیج دور دور پھینک دئے جاتے ہیں۔ اکثر پھلیاں پختہ ہوتے کے بعد تڑک جاتی ہیں اور ان کے گرد بار فوراً بل کھا جاتے ہیں جس کی وجہ سے بیج نکل پڑتے ہیں اور دور دور پھیل جاتے ہیں۔

RHUELLIA TUBEROSA کے پختہ کیسے کا تماس جب رطوبت سے ہوتا ہے تو وہ پھٹتا ہے اور بیجوں کو آزاد کر دیتا ہے۔ اس کا مشاہدہ ہر ایک طالب علم نے لڑکپن میں پانی میں ضرور کیا ہوگا۔

۵) اتفاقی انتشار

چوہے۔ گلہری اور چونٹیاں وغیرہ سوراخوں میں اپنے کھانے کے بعد کچھ اناج رکھ چھوڑتے ہیں اور یہ اناج پودوں میں تبدیل ہوجاتا ہے ہریالی کے بیجوں پر شیریں ارل رہتا ہے جس کے لئے چونٹیاں

بیجوں کو اپنے سوراخوں میں لے جاتی ہیں اور جمع کرتی ہیں۔ ارل جب کھا لیا جاتا ہے تو بیج نہایت سخت اور چکنے ہونے کی وجہ سے چونٹیوں کے لئے بالکل بیکار ہو جاتے ہیں اس لئے ان کو دور دراز مقامات پر پھینک دیتے ہیں جہاں وہ اگ جاتے ہیں۔

انسان بھی پھلوں اور بیجوں کے انتشار میں اچھا حصہ لیتا ہے یہ دور دراز مقامات سے اپنی خواہش کے مطابق پودے اور میوے منگاتا ہے۔ ایک ملک کے پھل کئی ملکوں کو روآنہ کئے جاتے ہیں اس طرح بیج تمام دنیا میں پھیل جاتے ہیں۔ آم۔ سیب۔ انگور۔ انار۔ تربوز اور خربوز غرض کہ جملہ میوے جن کو ہم کھاتے ہیں اس کی مثالیں ہیں۔ آلو۔ پپی۔ تمباکو اور مکئی غیر ممالک کے پودے تھے وہ ہندوستان میں اب اس طرح سے ہوتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کہ گویا یہیں کے پودے ہیں۔ مندرجہ ذیل چند مثالیں اس قسم کی دی جاتی ہیں جو غیر ممالک کے پودے ہیں لیکن صرف سیاحوں کے باعث ہمارے ملک میں بھی اب ان کی کاشت ہوتی ہے۔

تمباکو۔ یہ امریکہ کی پیداوار ہے۔ پرتگالی اس کو ۱۶۰۰ء میں ہندوستان لائے۔

مکئی۔ پرتگالی اس کو امریکہ سے تین سو برس پہلے یہاں لائے۔

سنکونا۔ ہندوستان میں اس کا بیج اپنے وطن اصلی یعنی جنوبی امریکہ سے آیا اور سرکاری طور پر اس کی کاشت ۱۸۶۲ء میں شروع ہوئی۔ آج کل دارجلنگ اور نیلگری کی پہاڑیاں اس کی کاشت کے مرکز ہیں۔

اودھ میں اردو شاعری کی ابتدا

از
محمد اعظم خاں ام۔ اے (عثمانیہ)

نوٹ:۔ "یہ مضمون خان صاحب کے اس مقالہ کا ایک حصہ ہے جو انھوں نے ام۔ اے کے امتحان کے لئے لکھا تھا"
(ادارہ)

جس زمانے میں شجاع الدولہ اودھ میں مسند نشین ہوئے تخت دہلی پر محمد شاہ کے بیٹے احمد شاہ متمکن تھے (۱۷۴۸ء تا ۱۷۵۴ء) لیکن عنان حکومت ہاتھ میں لیتے ہی وہ اہل دربار کی سازشوں میں پھنس گئے اور پورے چھ سال بھی حکومت نہ کرنے پائے تھے کہ بعض امرانے انھیں اندھا کر کے شاہزادہ معظم کے ایک پوتے کو عالمگیر ثانی کے لقب سے برائے نام تخت پر بٹھادیا اور خود حکمراں ہوگئے۔ اس طوائف الملوکی کی خبر افغانستان پہنچی تو نادر شاہ کے جانشین احمد شاہ ابدالی نے پھر ہندوستان پر لشکر کشی کی اور ابھی دہلی نادر کی تاخت و تاراج سے سنبھلنے نہ پائی تھی کہ اسے دوبارہ اچھی طرح لوٹا۔ اس بدنظمی کے سیلاب میں بڑے بڑے متقل مزاجوں کے قدم ڈگمگا گئے اور جو باکمال ابتک دہلی سے نکلنے کا نام نہ لیتے تھے اب سراسیمہ ہو کر اودھ کا رخ کرنے لگے جہاں شجاع الدولہ حکمراں تھے۔ ان ترک وطن کرنے والوں میں چند شاعر بھی تھے جن میں آرزو۔ فغاں۔ ضاحک۔ سوز۔ ضیا۔ اور سودا قابل ذکر ہیں۔ آرزو کے متعلق شمس العلما مولوی محمد حسین صاحب آزاد لکھتے ہیں کہ "خان آرزو کو زبان اردو پر وہی دعوے پہنچتا ہے جو ارسطو کو فلسفہ منطق پر ہے۔ جب تک کہ

کل منطقی ارسطو کے عیال کہلائیں گے تب تک اہل اردو خان آرزو کے عیال کہلاتے رہیں گے ....

خان آرزو وہی شخص ہیں جن کے دامن تربیت سے ایسے شائستہ فرزند پرورش پاکر اٹھے جو زبان اردو کے اصلاح دینے والے کہلائے .... یعنی مرزا جان جاناں ۔ مرزا رفیع ۔ میر تقی ۔ خواجہ میر درد وغیرہ ۔

شجاع الدولہ کے ماموں نواب سالار جنگ نے انہیں دہلی سے بلوایا اور بڑی تعظیم و تکریم سے اپنے پاس رکھا ۔ سرزمین اودھ میں شاعری کا بیج انہی کا بویا ہوا ہے لیکن اس نامساعد فضا کے باعث جس کی تفصیل آگے آئے گی اس کی نشو و نما نہ ہو سکی اور خود خان آرزو شجاع الدولہ کی مسند نشینی کے چار سال بعد یعنی ۱۱۶۹ھ ۱۷۵۵ء میں رحلت کر گئے ۔

ضاحک اپنے بیٹے میر حسن کے ساتھ شجاع الدولہ کے عہد میں فیض آباد آئے خود نواب سالار جنگ کے دامن دولت سے وابستہ ہو گئے ۔ اور بیٹے کو سالار جنگ کے صاحبزادہ مرزا نوازش علی خاں کی مصاحبت پر مامور کرا دیا ۔ آخر عمر تک یہیں رہے اور آصف الدولہ کے عہد میں انتقال کیا ۔ ان کا نہ تو آج کلام ملتا ہے اور نہ یہ اپنے دور کے شعرا میں کوئی خاص درجہ رکھتے ہیں ۔ ان کی شہرت یا تو ان ہجوؤں کی وجہ سے ہوئی جو سودا نے ان کی شان میں کہی تھیں یا ان کے بیٹے میر حسن کی وجہ سے ہوئی جن کی مثنوی بے نظیر بدر منیر اردو زبان میں بہت مشہور ہے ۔ سودا اس وقت فیض آباد آئے جب شجاع الدولہ کا عہد ختم ہو رہا تھا یعنی ۱۷۷۳ء میں ۔ اس طرح ان کے بمشکل دو برس شجاع الدولہ کے عہد میں کٹے اور زیادہ تر زمانہ آصف الدولہ کے دور حکومت میں بسر ہوا اس لئے ان کا شمار درحقیقت عہد آصف الدولہ کے شعرا میں ہونا چاہئے نہ کہ عہد شجاع الدولہ کے ۔ اس وجہ سے ہم ان کا تفصیلی ذکر آئندہ باب میں کریں گے ۔ اب اس عہد کے تین شاعر یعنی سوز ۔ ضیا ۔ اور فغاں رہ گئے ۔ ان میں سے کوئی بھی فیض آباد میں مستقل طور پر سکونت پذیر نہ ہوا اور سب چند روز یہاں رہ کر کہیں نہ کہیں چلے گئے ۔ تذکرہ نویسوں نے اس کے مختلف وجوہ لکھے ہیں اور فی الواقع یہ بہت غور طلب اور بڑا دلچسپ مسئلہ ہے کہ اودھ کی بساط ادب نے ان اساتذہ سخن کو جو اپنے زمانے کے مسلم الثبوت باکمال مانے جاتے تھے ۔ سر آنکھوں پر کیوں نہیں بٹھایا اور کیوں ان کی ایسی ناقدری کی

کہ وہ باہر جانے پر مجبور ہو گئے۔

عام طور پر اس کے جو وجوہ بیان کئے جاتے ہیں وہ چنداں قابل قبول نہیں مثلاً اشرف علی خاں فغاں جو شعرائے دہلی میں بہت نامور گزرے ہیں فیض آباد میں چند روز رہ کر پٹنہ چلے گئے تھے۔ اس کی وجہ مولوی محمد حسین آزاد یہ لکھتے ہیں کہ شجاع الدولہ کے ہاتھ سے اتفاقاً ایک روزان کا کپڑا جل گیا تھا جس سے وہ ناراض ہو گئے۔ ظاہر ہے کہ ایسی معمولی بات اودھ جیسے مامن کو چھوڑ کر پٹنہ کا دور دراز سفر اختیار کرنے کی محرک کسی طرح نہیں ہو سکتی۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ ایک دل برداشتہ آدمی کے لئے یہ بہانہ بن جائے لیکن اصلی سبب فغاں۔ سوز اور ضیا جیسے شعرا کی ناقدری کا یہ ہے کہ شجاع الدولہ کا عہد شعر و سخن کے لئے سخت نامساعد واقع ہوا تھا۔ شاعری اور اس میں بھی خصوصیت کے ساتھ عاشقانہ شاعری کے لئے ضرورت ہے ایسی فضا کی جہاں سکون و اطمینان۔ مال و دولت اور عیش و عشرت ہو۔ اس کے برخلاف شجاع الدولہ کا عہد ہندوستان کی تاریخ میں انتہائی پر آشوب زمانہ تھا۔ ایک طرف دہلی کی عظیم الشان سلطنت اپنی آخری سانسیں لے رہی تھی۔ دوسری طرف انگریزوں کا تسلط ہندوستان کے طول و عرض پر روز بروز بڑھتا جا رہا تھا۔ تیسری طرف مرہٹے سارے ملک میں ایک ہنگامہ برپا کر رہے تھے اور چاہتے تھے کہ مسلمانوں کا نام ہند کی سرزمین سے مٹادیں چوتھی طرف افغانی حملہ رہ رہ کر لشکر کشی کر رہے تھے۔ ان حالات میں شجاع الدولہ جیسے جنگجو فرماں روا کو جو اسم بامسمّا تھا اس کی کہاں فرصت تھی کہ وہ عیش و عشرت کی محفلوں اور شعر و سخن کی مجلسوں میں اپنا وقت گزارتا۔

اس نے عنان حکومت ہاتھ میں لیتے ہی فوجوں کی اصلاح و تنظیم شروع کر دی اور جتنے اہم معرکے اس کے عہد میں ہوئے ان میں سے اکثر میں حصہ لیا۔ ۱۷۶۱ء میں جب احمد شاہ ابدالی مرہٹوں کی روز افزوں قوت توڑنے کے لئے پانی پت کے میدان میں صف آرا ہوا تو شجاع الدولہ بھی اسی کے ساتھ شریک ہوئے اور پانی پت کی وہ مشہور تیسری لڑائی ہوئی جس نے ہمیشہ کے لئے مرہٹوں کی قوت کا خاتمہ کر دیا۔

اس کے تین سال بعد ۱۷۶۴ء میں میر محمد قاسم ناظم بنگالہ اور انگریزوں کے درمیان بکسر میں

معرکہ کارزار گرم ہوا تو شجاع الدولہ انگریزوں کے مقابلہ میں محمد قاسم کے ساتھ شریک ہوئے جس میں انھیں شکست ہوئی اور پچاس لاکھ روپے تاوان جنگ دینا پڑا اس کے علاوہ انگریزوں سے ایک معاہدہ کرنا پڑا جس کی رو سے انگریز رزیڈنٹ دربار اودھ میں متقرر ہوا اور کانپور و فرخ آباد میں انگریزی چھاونیاں قائم کی گئیں ان چھاونیوں کے چوبیس لاکھ روپے سالانہ اخراجات بھی نواب ہی کے ذمہ لگائے گئے۔

۱۷۷۴ء میں شجاع الدولہ نے روہیلکھنڈ پر چڑھائی کی اور انگریزی فوج کی مدد سے سارے ملک کو ایسا تباہ و برباد کیا کہ اس کی دردناک داستان آج تک زبان زد عام ہے غرض شجاع الدولہ کی ساری عمر انہی فوجی مہمات میں گذری اور انھیں ان علمی مشاغل کی طرف توجہ کرنے کی مہلت نہ ملی جو امن واطمینان کے زمانے سے تعلق رکھتے ہیں

یہی سبب تھا کہ جو اہل قلم اس عہد میں دہلی سے آئے ان کی کما حقہٗ قدر نہ ہوسکی اور شاعری کو دربار کی سرپرستی حاصل نہ ہوئی آرزو، ضاحک اور میر حسن بھی جو آخر عمر تک اودھ میں رہے صرف سالار جنگ کی فیاضیوں کے سہارے جیا کئے اور ان کی حوصلہ افزائی میں شجاع الدولہ کا بہت ہی کم حصہ رہا۔ باوجودیکہ خان آرزو جیسے باکمال شاعر اور ان کے تلامذہ نے اودھ کی سرزمین میں شاعری کا بیج بویا تھا لیکن ناموافق فضا کی وجہ سے ابتدا میں اس کا نشو ونما پوری طرح نہ ہوسکا۔ اور اصلی فروغ اسے اسی وقت حاصل ہوا جب شجاع الدولہ کے جانشین آصف الدولہ کے فیض کی گنگا نے اس کی آبیاری کی۔ اس طرح یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ شجاع الدولہ کے عہد میں اردو شاعری درباری اثرات سے بالکل متاثر نہیں ہوئی۔ حکمران وقت اور اہل دربار کے سپاہیانہ مشاغل کی جھلک بھی اس دور کی شاعری میں نہیں پائی جاتی اس لئے کہ یہ ایسے قدردانوں کے سایہ عاطفت میں پلی جو اس زمانہ کی سیاسی الجھنوں سے دور اطمینان و فراغت اور لطف و مسرت کی زندگی گزار رہے تھے۔ جس طرح اودھ کی ادبی تاریخ میں شجاع الدولہ کا کہیں ذکر نہیں ملتا اسی طرح اس کی سیاسی تاریخ میں سالار جنگ اور مرزا علی خاں کا نام نہیں دکھائی دیتا۔ اسی وجہ سے اس عہد کی شاعری رزم کی بجائے بزم کی آئینہ دار یعنی شجاع الدولہ کی بجائے سالار جنگ کی یادگار ہے

آصف الدولہ کا عہد (۱۷۷۵ء تا ۱۷۹۷ء) سودا میر و سوز کا دور

۱۷۶۵ء کے عہد نامہ کے بعد سے انگریز اودھ کی فوجی سرگرمیوں پر سخت نگرانی رکھنے لگے تھے اور یہ شجاع الدولہ ہی کا حق تھا کہ وہ اس جکڑ بند کے باوجود آخر وقت تک اپنی فوجی طاقت برقرار رکھنے میں کامیاب ہوئے لیکن آصف الدولہ باپ کی طرح سپاہی منش نہ تھے اس لئے انگریزوں نے نہایت آسانی سے انھیں اپنے ڈھب پر لگایا اور تھوڑے ہی عرصہ میں دربار کا رنگ بالکل بدل گیا جو روپیہ برہان الملک اور شجاع الدولہ کے عہد میں قلعوں کی تعمیر و ترمیم پر صرف ہوتا تھا آصف الدولہ کے زمانہ میں شہر کی آرائش و زیبائش پر صرف ہونے لگا اور جو وقت پہلے فوجوں کی اصلاح و تنظیم میں صرف ہوتا تھا اب عیش و عشرت کے جلسوں کی انذر ہونے لگا۔

اس صورت حال نے اودھ کی سیاسی پوزیشن کو خواہ کتنا ہی کمزور کر دیا ہو لیکن دربار کی ظاہری رونق کو بے انتہا ترقی دے دی۔ اب دربار اودھ کی حالت اس مسرف کی سی ہو رہی تھی جو اندر سے تو کھوکھلا ہو لیکن اس کی ظاہری شان و شوکت لوگوں کے لئے مقناطیسی کشش رکھتی ہو۔ ان ہی فضول خرچیوں کی وجہ سے چند ہی سال میں آصف الدولہ اور ان کی بیدار مغز ماں بہو بیگم میں سخت ناچاقی ہوگئی اور ۱۷۷۵ء میں پایہ تخت فیض آباد سے لکھنؤ منتقل کر دیا گیا تاکہ ماں کی مداخلت کے بغیر بادشاہ آزادی کے ساتھ اپنے مرغوب طبع مشاغل میں منہمک رہ سکیں۔ آصف الدولہ کو اگرچہ ان تمام مشاغل سے دلچسپی تھی جو شاہان دہلی کی تباہی کا باعث ہوئے تھے لیکن شاعری سے انھیں جتنا شغف تھا اتنا کسی اور چیز سے نہ تھا۔ وہ آصف تخلص کرتے تھے اور بڑے پر گو شاعر تھے جس کی یادگار آج بھی ایک ضخیم دیوان کی صورت میں باقی ہے۔ جب خود بادشاہ کے ذوق کا یہ حال ہو تو پھر شعرا کی قدر دانی کا کیا عالم ہوگا اب لکھنؤ دہلی کی تہذیب و تمدن اور علم و فضل کے ساتھ وہاں کے عیش و عشرت شعر و سخن کا بھی

پورا پورا جانشین بن گیا اور دہلی کے کئی مشہور شاعر لکھنو میں جمع ہو گئے جن میں قابل ذکر سودا (۱۷۱۳ء تا ۱۷۸۱ء) میر (۱۷۲۴ء تا ۱۸۱۰ء) سوز (۱۷۲۰ء تا ۱۷۹۸ء) اور مصحفی (۱۷۵۰ء تا ۱۸۲۴ء) ہیں۔

مرزا رفیع سودا جیسا کہ اوپر بیان ہوا ۱۷۷۳ء میں یعنی آصف الدولہ کی تخت نشینی سے دو سال پہلے فیض آباد آئے اور جب آٹھ سال بعد صوبہ کا مستقر لکھنو منتقل ہوا تو یہ بھی یہیں آ گئے لیکن قضا بھی ان کے ساتھ ہی پہنچی اور یہ اسی سال پیوند خاک ہو گئے۔ اس طرح ان کے کل چند سال عہد آصف الدولہ میں گذرے ان کی وفات کے نو سال بعد ان کے مشہور مد مقابل میر محمد تقی میر ۱۷۸۲ء میں لکھنو آئے اور ستائیس سال رہ کر یہیں وفات پائی۔ میر کے سات سال بعد ۱۷۹۰ء میں شیخ غلام ہمدانی مصحفی آئے اور چونتیس سال رہ کر قضا کی مصحفی کے سات سال بعد یعنی ۱۷۹۷ء میں سید محمد میر سوز جو اس سے قبل اودھ سے نامراد مرشد آباد گئے تھے آصف الدولہ کے فیض کا شہرہ سن کر پھر یہاں آئے اور اس مرتبہ قسمت کی رسائی سے آصف الدولہ کے استاد ہو گئے لیکن ایک ہی سال بعد وفات پائی۔

ان کے علاوہ اس عہد کے اور بھی کئی شعرا کا پتہ چلتا ہے لیکن نہ تو ان کے مفصل حالات معلوم ہوئے ہیں نہ ان کا کلام دستیاب ہوتا ہے اس لئے یہ اندازہ نہیں لگایا جا سکتا کہ دربار کے رنگ نے ان کے کلام پر کیا اثر ڈالا اس طرح مرزا فاخر مکین سرپ سنگہ دیوانہ۔ شیخ بقاء اللہ خاں بقا اور مرزا جعفر علی حسرت وغیرہ کے نام اگرچہ اکثر لئے جاتے ہیں لیکن ان کے حالات اس قدر تاریکی میں ہیں کہ سنہ وفات تک کا پتہ نہیں چلتا

آصف الدولہ کی فیاضیوں نے صرف ان شعرا ہی کو نہیں کھینچ بلوایا بلکہ خود شاہزادگان دہلی ان کی داد و دہش کا شہرہ سن کر لکھنو کا رخ کرنے لگے اور اپنا آبائی وطن چھوڑ کر یہیں سکونت اختیار کر لی۔ چونکہ یہ شہزادے آگے چل کر دربار اودھ کا ایک جزو بن گئے اور ان کے اطوار کا بڑا اثر لکھنو کی شاعری پر پڑا اس لئے مختصراً ان کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے۔ ۱۷۸۴ء میں مرزا جوان بخت جو دہلی کے بادشاہ وقت یعنی شاہ عالم ثانی (۱۷۶۲ء تا ۱۸۰۶ء)۔ کے ولیعہد تھے اپنے باپ کی پر آشوب سلطنت کو انہی پر چھوڑ کر نہایت بے سروسامانی کے ساتھ لکھنو پہنچے۔ آصف الدولہ نے کمال اعزاز و احترام کے ساتھ ان کا استقبال کیا۔

تین لاکھ روپے کا نقد و جنس نذر گزرانا اور پچیس ہزار روپے ماہوار مقرر کئے۔ شاہزادہ والاتبار اب یہاں عیش کی زندگی بسر کرنے لگے اور مرغبازی۔ پتنگ بازی۔ ناچ و رنگ اور شعر و سخن کی مجلسوں میں آصف الدولہ کے ہم پیالہ و ہم نوالہ رہنے لگے۔ شومی قسمت سے درباری ارباب نشاط میں بھگیہ نام ایک طوائف تھی جس پر شاہزادہ کا دل آگیا اور انھوں نے اسے اپنے حرم میں داخل کرنا چاہا۔ اتفاق سے وہ خود آصف الدولہ کی منظور نظر تھی اس لئے وہ اس پر راضی نہ ہوے مگر شاہزادہ کو اس کی ایسی لو لگی تھی کہ وارن ہیسٹنگز گورنر جنرل کے ذریعہ سے جو اس زمانے میں لکھنو آئے ہوے تھے سفارش کرائی اور آصف الدولہ کو مجبوراً ماننا پڑا اس طرح شاہزادہ کو بھگیہ تو مل گئی مگر لکھنو چھوڑنا پڑا کیونکہ آصف الدولہ ان سے ناراض ہو گئے اور انھیں مجبوراً بنارس میں جا کر قیام کرنا پڑا[1] ۱۸۰۷ء میں ان کے دوسرے بھائی مرزا سلیمان شکوہ وارد لکھنو ہوے۔ آصف الدولہ بڑے بھائی کا رنگ دیکھ چکے تھے اس لئے ان کے استقبال میں پس و پیش کیا اور شہزادہ کو کئی مہینہ لکھنو سے باہر ٹھہرنا پڑا۔ آخر لارڈ کارنواس گورنر جنرل کی سفارش سے نواب نے انھیں قیام لکھنو کی اجازت دی اور چھ ہزار ماہہ مقرر کیا۔ یہ عرصہ دراز تک لکھنو میں رہے لیکن نصیر الدین حیدر کے زمانے میں ان کے ساتھ کچھ ایسا ہی قضیہ نامرضیہ پیش آیا جس کے سلسلہ میں یہ لکھنو سے چلے گئے اور ۱۸۳۷ء میں بہ مقام اکبرآباد وفات پائی۔

شہزادہ سلیمان شکوہ لکھنو کی تاریخ ادب میں بطور خاص قابل ذکر ہیں اس لئے کہ یہ خود شاعر تھے اور شعرائے دہلی کی بڑی سرپرستی کرتے تھے۔ لکھنو آنے کے بعد ان کا در دولت عرصہ دراز تک کئی مشہور شعرا کا مرکز رہا ہے۔ انشا۔ مصحفی۔ رنگیں۔ جرأت سب ان کے خوان نعمت کے خوشہ چیں تھے اور ان ہی کے تقرب اور استادی کے سلسلہ میں وہ نزاع پیدا ہوئی جس نے انشا و مصحفی کو مد مقابل بنا کر لکھنو کی شاعری میں ایک مزید افسوس ناک باب کا اضافہ کیا۔ مولوی محمد حسین آزاد ان کے متعلق لکھتے ہیں کہ "عام اہل دہلی کے علاوہ شعرا کا مجمع دونوں وقت ان کے ہاں رہتا تھا۔ سودا۔ میر ضاحک۔ میر سوز وغیرہ کا ورق زمانہ الٹ چکا تھا۔ مصحفی۔ جرأت۔ مرزا قتیل وغیرہ شاعروں اور شعر فہموں کے جلسے رہتے تھے

[1] قیصر التواریخ جلد اول صفحہ ۱۱۰ و ۱۱۱
[2] آب حیات صفحہ

جو محفل ایسے گلشن فصاحت کے گلدستوں سے سجائی جائے وہاں کی رنگینیاں کیا کچھ ہوں گی۔ جی چاہتا تھا کہ ان کی باتوں سے گلزار کھلادوں مگر اکثر پھول ایسے فحش کانٹوں میں الجھے ہوئے ہیں کہ کاغذ کے پرزے ہوئے جاتے ہیں اس لئے صفحہ پر پھیلاتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔ چند سال بعد ان کے چھوٹے بھائی مرزا اسکندر شکوہ بھی لکھنو آگئے اور آصف الدولہ نے دو ہزار ماہوار ان کی بھی مقرر کردی اس طرح دہلی کے تمام منتشر اجزا لکھنو میں جمع ہونے لگے اور اس عیش و عشرت نمائش و تکلف بے فکری و بیکاری، مفت خوری و بے حیائی، درباداری و راحت طلبی کی بنیاد پڑی جس نے آخر کار شاعری کے ساتھ سلطنت کو بھی ڈبو دیا۔

ایسے دربار کے جو اثرات اس دور کی شاعری پر مترتب ہوئے ان کا اندازہ کرتے وقت ہمیں چند امور کا بطور خاص لحاظ رکھنا چاہئے۔

پہلے تو یہ کہ عہد آصف الدولہ میں جو شعرا دہلی سے آئے وہ سن رسیدہ ہو چکے تھے ان کا ایک خاص رنگ مستحکم ہو گیا تھا ان کی تخلیقی قوت جواب دے چکی تھی۔ ان کی جوانی کی امنگیں اور شاعری کے ولولے سرد پڑ گئے تھے۔ سودا جب لکھنو آئے تو ان کی عمر ۱۰ سال کی تھی۔ میر کی ۶۰ سال۔ سوز کی ۶۴ سال اور مصحفی کی ۴۰ سال۔ اس طرح بجز آخر الذکر کے اور سب عمر طبیعی کو پہنچ چکے تھے ظاہر ہے کہ ایسے پختہ طبیعتوں پر کوئی رنگ آسانی سے نہیں چڑھ سکتا۔

دوسرے یہ کہ یہ لوگ اپنے عہد کے ممتاز ترین شعرا اور مسلم الثبوت اساتذہ مانے جاتے تھے اس لئے وہ شاہی تقرب کی خاطر کوئی نیا رنگ اختیار کرنے پر چنداں مجبور نہ تھے۔

تیسرے یہ کہ ان کے کلام کا وہ حصہ جو لکھنو میں مرتب ہوا پوری طرح متعین نہیں کیا جا سکتا اور بجز ان چند نظموں کے جن میں خاص خاص حوالے ہیں باقی کلام کے مولد کے متعلق کوئی قطعی رائے نہیں قائم کی جا سکتی۔ ایسے حوالے صرف قطعوں یا مثنویوں میں ملتے ہیں غزلیات میں (جس پر ان کے کلام کا بیشتر حصہ مشتمل ہے) ان کا پتہ نہیں چلتا ان سب باتوں کو پیش نظر رکھنے کے باوجود بھی یہ کہنا بیجا نہیں کہ دربار اودھ کے اس رنگ کا ان شعرا پر کچھ نہ کچھ مضر اثر ضرور پڑا مثلاً میر کے سے قادر الکلام اور سرتاج شعرا

کو دیکھئے کہ لکھنؤ میں آکر ان کی فکر سخن کیسے ادنی اور معمولی مضامین پر اتر آتی ہے۔ کبھی تو وہ آصف الدولہ کے ہولی کھیلنے کا ذکر کرتے ہیں تو کبھی ان کے شکار کرنے کا۔ کہیں مرغبازی پر مثنوی لکھتے ہیں تو کہیں بندر بلی اور بکری پر۔ ایک قطعہ میں آصف الدولہ کے گھوڑے کی تعریف کرتے ہیں تو دوسرے میں کسی خواجہ سرا کی ہجو۔ پس جب ہم ان کی ایسی پست و رکیک شاعری کا اس بلند رتبہ کلام سے مقابلہ کرتے ہیں جن میں بقول خود میر "جہاں سے دیکھئے یک شعر شور انگیز نکلے ہے ۔ قیامت کا سا ہنگامہ ہے ہر جا میرے دیواں میں"

تو ہمیں مولانا آزاد کے اس قول سے اتفاق کرنا پڑتا ہے کہ "پستش بغایت پست و بلندش بغایت بلند" اور اس باہمی فرق کو ماحول کے اختلاف پر محمول کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہوتا۔

کم و بیش یہی حال سودا کا ہے۔ سودا نے اپنی اہاجی میں جو رکاکت داخل کی وہ ناگفتہ بہ ہے پھر یہ ان کے کلام میں کوئی اضافی چیز نہیں بلکہ ان کے کلیات میں ایسا ہی مستقل درجہ رکھتی ہے جیسا کہ ان کی زندگی کا ایک مستقل جزو تھی۔

ان ہجویات کے متعلق یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ وہ تمام تر سرزمین اودھ ہی کی پیداوار ہے لیکن اس میں شبہ نہیں کہ اگر ان کے مدت قیام کا لحاظ رکھا جائے تو بیشک اودھ کا پلہ بھاری رہے گا کیونکہ سودا کی وہ گل افشانی جو غلام حسین ضاحک۔ مرزا فاخر مکین۔ بقا اللہ خاں بقا مکند رام فدوی وغیرہ کی شان میں ہوئی زیادہ تر یہیں کی یادگار ہے دربار اودھ کے اثر سے سودا کی طبع رسا کی بجلی ایک اور افق پر بھی چمکی تھی جو اس سے بالکل مختلف ہے اور جس کا مختصر ذکر یہاں ضروری معلوم ہوتا ہے۔

اوپر بیان ہو چکا ہے کہ آصف الدولہ کے مورث اعلی میر محمد نصیر مذہب امامیہ سے تعلق رکھتے تھے اس لئے ان کی اولاد میں جتنے فرمان روا گزرے وہ سب اسی مذہب کے پیرو رہے لیکن پہلے تین حکمراں ایسی سخت سیاسی کشمکش میں گرفتار تھے کہ انہیں مذہبی معاملات میں کسی طرح کی دلچسپی لینے کا موقع نہیں ملا۔ آصف الدولہ کے زمانے میں جب انگریزی مداخلت کی بدولت اودھ کی سیاسی جدوجہد کا خاتمہ ہو گیا تو یہ مذہبی عصبیت بھی رنگ لانے لگی چنانچہ آصف الدولہ کے مشہور وزیر سرفراز الدولہ مرزا حسن رضا خاں

جو نہایت کٹے متعصب شیعہ تھے۔ پہلے پہل شیعیت کی شاہی سرپرستی کا باعث ہوے اور سلطنت میں مجتہد العصر کا عہدہ قائم کرایا جس پر علامہ سید دلدار علی کا تقرر ہوا اس کے بعد ۵، لاکھ روپے اور گراں بہا تحائف شاہ بغداد کو بھیجے گئے تاکہ دریائے فرات سے نجف اشرف تک ایک نہر جاری کی جائے اور دس لاکھ کے صرفہ سے لکھنؤ میں ایک امام باڑہ تیار کروایا گیا جو دس سال کے عرصہ میں ۱۸۰۵ئہ میں تکمیل کو پہنچا۔ غرض یہ کہ اسی زمانے میں وہ مذہبی جانب داری شروع ہوئی جس نے آگے چل کر ایک مستقل تحریک کی صورت اختیار کرلی۔

دربار اودھ کے اس رجحان نے شمالی ہند میں پہلے پہل اس صنف سخن کا اضافہ کیا جو اگرچہ دکن میں سالہا سال سے رائج تھی۔ لیکن شمال کی شاعری میں اب تک اس کا مستقل وجود نہ پایا جاتا تھا یہ مرثیہ گوئی تھی جس میں سودا کے علاوہ اور بھی کئی شعرا نے طبع آزمائی کی جن میں میر ضاحک۔ میر حسن اور سکین قابل ذکر ہیں۔ سودا نے نہ صرف طبع آزمائی کی بلکہ کئی ایسی ترمیمیں بھی کیں جو نہایت اہم ثابت ہوئیں اور جنھیں شعرائے ما بعد نے مستقل طور پر اختیار کر لیا مثلاً یہ کہ اس وقت تک مرثیے مربع ہوا کرتے تھے سودا نے اسے مسدس بنایا۔ پہلے مرثیے محض ایک طرح کا بین ہوتے تھے۔ سودا نے ان میں ادبی شان پیدا کی۔ غرض اس زمانہ میں مرثیہ میں جو کچھ ترقی ہوئی وہ دربار اودھ ہی کے اثر سے ہوئی اور سودا کے اختراعات کا باعث بھی مذہبی رجحان تھا۔

مصحفی اودھ میں سینتیس سال رہے جس میں سے صرف سات سال آصف الدولہ کے عہد کے تھے باقی تیس سال دیگر فرمانرواؤں کے عہد کے۔ اس کے علاوہ ان کے اصل معرکے سید انشا کے ساتھ رہے جو سعادت علی خاں کے عہد میں لکھنؤ آئے تھے اور انہی کے دربار سے تعلق رکھتے تھے۔ اس طرح مصحفی کا شمار عہد سعادت علی خاں کے شعرا میں ہونا چاہئے۔ چنانچہ ہم انہی کے دور میں ان کا تفصیلی ذکر کریں گے۔ اب رہ گئے میر سوز سو ان کا لکھنؤ میں کل قیام دو تین سال سے زیادہ نہیں رہا۔ ظاہر ہے کہ اتنی قلیل مدت میں ایک کہنہ مشق شاعر پر کسی طرح کا کوئی اثر نہیں پڑ سکتا اس لئے میر سوز کا شمار لکھنوی شعرا میں کرنا صحیح نہیں۔ البتہ ان کے شاگرد نواب آصف الدولہ آصف کا کلام اس زمانے کی سوسائٹی کا بہترین مرقع

اور اس عہد کے دربار کی حقیقی یادگار کہلایا جاسکتا ہے اس لئے کہ نہ صرف ان کا خمیر خاک اودھ سے تھا بلکہ دربار اور دربار کا رنگ عبارت تھا انہی کی ذات سے۔ ان کا دیوان اگرچہ طبع نہیں ہوا اور نہ عام طور پر دستیاب ہوتا ہے لیکن خوش قسمتی سے اس کا ایک قلمی نسخہ جو خود ان ہی کے ہاتھ کا لکھا ہوا بیان کیا جاتا ہے کتب خانہ آصفیہ میں موجود ہے۔ جس کی بدولت ہماری نگاہوں کے سامنے اس زمانے کا مذاق اور دربار کی حالت اس طرح آئینہ ہو جاتی ہے کہ اودھ کی کوئی بڑی سے بڑی تاریخ بھی اسے اس طرح نمایاں نہیں کرسکتی۔

اس کلیات میں غزلیں۔ قصائد۔ مثنویاں مخمس۔ رباعیاں غرض تمام اصناف سخن موجود ہیں۔

سکونِ حیات

از

اختر حسین اختر (جامعہ عثمانیہ)

شراب غم کے مزے سے جو کامیاب ہوا
ہر ایک جلوۂ راز اُس پہ بے نقاب ہوا

یہ کائنات ہے کیا، اک الم کدہ ہے یہ
گزر خوشی کا نہیں یاں کہ غم کدہ ہے یہ

حیات ایک پیالہ ہے زہر سے لبریز
بغیر جس کو پئے ہے کسے مجالِ گریز

مگر یہ زہر بھی کتنا لذیذ ہے ہمدم!
کہ اُس کا ذکر بھی ہے باعثِ سرورِ اتم

کسی کو شوق کہ اُس کو ٹھہر ٹھہر کے پیئے
غرض یہی ہے کہ جب تک بھی جی سکے وہ جیے

بچا بچا کے زمانے سے کوئی رکھتا ہے
چھپا چھپا کے مگر صبح و شام چکھتا ہے

یہ چاہتا ہے کوئی ایک سانس میں پی جائے
وفورِ شوق میں یوں پیاس زندگی کی بجھائے

یہ سب کے سب اُسے کیف آفریں سمجھتے ہیں
غضب کہ زہر کو بھی انگبیں سمجھتے ہیں

مگر وہ جو [illegible] اسرار زندگی [illegible]
اسی خیال میں رہتے ہیں رات دن مغموم

وہ جانتے ہیں کہ کیوں خوش ہو ر ازندگی کیلئے
یہ جامِ زہر تو قاتل ہے آدمی کے لئے

وہ کھِل کھلا کے نہیں ہنستے مسکراتے ہیں
وہ جامِ زہر میں تھوڑا سا غم ملاتے ہیں

اگرچہ ہونٹوں پہ ہوتا ہے اک تبسّم سا
دل اُن کا رہتا ہے گردابِ غم میں کچھ گُم سا

وہ سوچتے ہیں سمجھتے ہیں رازِ عمرِ عزیز
وہ جان دیتے ہیں جب جان جاتے ہیں ہر چیز

وہ اپنی روح کی عظمت چھپا نہیں سکتے
وہ تنگ جسم میں اپنے سما نہیں سکتے

وہ مرگ و زیست کے اسرار جان لیتے ہیں
وہ آنسوؤں میں تبسّم کو گھول دیتے ہیں

اجل کے آنے سے ہوتا نہیں ہے اُن کو ملال
کمالِ شوق سے کرتے ہیں اُس کا استقبال

غمِ حیات کو وہ بھول جاتے ہیں اُس دم
کہ قصرِ مرگ کے دروازے کھلتے ہیں پیہم

نظر کے سامنے ہوتا ہے گُلستانِ بقا
وہ دیکھتے ہیں نئی زندگی، نئی دُنیا،

فنا کے در سے گزر کر جب اُس میں جاتے ہیں
وہاں پہنچ کے سکونِ حیات پاتے ہیں

اقبال کی غزلیں

از

سکندر علی وجد بی اے (عثمانیہ)

یہ صحیح ہے کہ اقبال کی غزلیں اس کی نظموں سے پست ہیں لیکن اس خیال کا یہ مفہوم ہرگز نہیں ہے کہ وہ اپنے ہمعصروں سے غزل کے میدان میں پیچھے ہے بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ گنتی کی چند غزلوں کے باوجود اقبال نے جو ٹھیٹھ تغزل پیش کیا ہے اس کا جواب بہت سارے صاحب دیوان یعنی پیشہ ور غزل گو شعرا بھی پیش کرنے سے قاصر ہیں۔

حالی کی شہرت کا باعث اس کی مسدس ہوئی لیکن اس امر سے کون انکار کرسکتا ہے کہ غزل کے میدان میں بھی اس نے سیکڑوں غیر فانی نقوش چھوڑے ہیں جن پر اردو ادب جتنا ناز کرے بجا ہے۔ یہی حال اقبال کا بھی ہوا کہ اس کے اعلیٰ پایہ نظموں کے آگے اس کی غزلیں زیادہ چمک نہ سکیں لیکن جب انھیں کو اس کے ہمعصروں کی غزلوں کے مقابل رکھا جاتا ہے تو یہ آفتاب و ماہتاب بن کر چمک اٹھتی ہیں۔

یہ خیال بالکل غلط ہے کہ اقبال اپنی فلسفیانہ ذہنیت کے سبب غزل میں جیسا چاہیے ویسا سوز و گداز پیدا نہیں کرسکتا اور قومی شاعری کے رجحان کے باعث وارداتِ حسن و عشق کے بیان پر پوری قدرت

نہیں رکھتا۔ دراصل اقبال فلسفی اور صوفی سے زیادہ شاعر ہے اور شاعر بھی وہ جو صرف حسن کا پجاری ہے اور عشق کا سیوک۔ اقبال حسن و عشق کی ماہیت اور اہمیت سے بخوبی واقف ہے چنانچہ کہتا ہے ؎

عقل کو تنقید سے فرصت نہیں
عشق پر اعمال کی بنیاد رکھ!

جس شاعر کے تمام اعمال کی نبیاد محبت پر ہو اس کے کلام میں جس قدر سوز و گداز اور تاثیر ہو کم ہے اقبال کی غزلیں شگفتہ، سلیس اور پر اثر ہیں۔ ان میں کہیں تو حافظ کی رندمشربی جھلکتی ہے اور کسی جگہ داغ کی زبان کا چٹخارہ محسوس ہوتا ہے۔ وہ کبھی حافظ کا ہمنوا بن کر کہتا ہے کہ۔

بھلا نبھے گی تری ہم سے کیونکر اے واعظ!
کہ ہم تو رسم محبت کو عام کرتے ہیں

تو کسی وقت داغ کا ہمزبان ہو کر پوچھتا ہے کہ

تامل تو تھا ان کو آنے میں قاصد
مگر یہ بتا طرز انکار کیا تھی!!
تمھارے پیامی نے سب راز کھولا خطا اس میں بندے کی سرکار کیا تھی

حالی نے غزل کی اصلاح کی جو صدا بلند کی تھی اقبال نے اس پر لبیک کہا اور اس پر عمل بھی کر کے دکھا دیا اقبال نے غزل کے میدان کو وسیع کیا۔ غزل کی جس تنگنائی کا غالب ہمیشہ رونا روتا رہا۔ اقبال نے اس کو کشادہ کیا تاکہ اس کا وسعت طلب زور بیان محدودیت نہ محسوس کرے چنانچہ اس کی غزلیں عشق و محبت، فلسفہ و حکمت اور پند و موعظت سے بھری پڑی ہیں۔ حالی کی طرح اقبال نے بھی بعض مسلسل غزلیں کہی ہیں لیکن یہ کوئی عیب نہیں۔ اگر یہ عیب ہی ہے تو اس سے بہترین غزل گو شعرا بھی نہ بچ سکے۔ اسی خصوصیت کی بنا پر کہا جاتا ہے کہ اقبال کی غزلوں میں بھی "نظمیت" جھلکتی ہے۔

اگر غالب پھر کچھ اک دل کو بیقراری ہے سینہ جویائے زخم کاری ہے

اور وہ فراق اور وہ وصال کہاں وہ شب و روز ماہ و سال کہاں

جیسی مسلسل غزلیں کہہ کر بھی بہترین غزل گو تسلیم کیا جاتا ہے تو پھر اقبال کو محض اس لئے کہ اس کی بعض غزلیں مسلسل ہیں، اس کو غزل گو شعرا کے زمرے ہی سے خارج کرنے والے کہاں تک حق بجانب ہیں؟

اس کے علاوہ اگر غالب اپنی فلسفہ طرازی، ذوق اپنے اخلاقی پند و نصائح، درد اپنے تصوف اور مومن اپنے نجوم و رمل کو بھی غزل میں بیان کرنے کے باوجود غزل گو کہلا سکتے ہیں تو صرف بعض سیاسی یا اصلاحی حالات کی بنا پر سرے سے اقبال کو غزل گوئی کے رتبہ بلند سے کیوں محروم کر دیا جاتا ہے؟

اقبال کی شاعری ایک خاص مقصد کے تابع ہے۔ وہ اپنی قوم کی پستی کو بلندی سے بدلنے کی دھن میں لگا ہوا ہے اس لئے اس کی غزلوں میں بھی اس کی دلی کیفیات کا عکس آجاتا ہے اقبال کی شاعری بیکاری کا مشغلہ یا دل لگی کا سامان نہیں ہے بلکہ وہ ایک پیام ہے، یہی چیز تھی جس نے اقبال کو بہت جلد غزل گوئی کو خیر باد کہنے پر مجبور کیا ورنہ جس طرح آج نظم کہنے میں کوئی اس سے برتری کیا ہمسری کا بھی دعویٰ نہیں کرسکتا، اسی طرح غزل گوئی میں بھی وہ امام تسلیم کیا جاتا۔ گو اقبال کے ہمہ گیر اور اعلیٰ تخیل نے اس کو غزل کی طرف زیادہ مائل ہی نہ ہونے دیا۔ لیکن اس پر بھی اس نے جو کچھ کہا خوب کہا، اور یہی نہیں بلکہ اچھے کہنے والوں سے اچھا کہا۔

بانگ درا میں اقبال کی غزلوں کے اشعار کی کل تعداد دو سو انیس (۲۱۹) ہے۔ اگر ان میں سے انتخاب کیا جائے تو یقیناً خیالات کی کثرت، اعلیٰ تخیل اور طرز ادا کے انوکھے پن کے لحاظ سے اردو کے کسی شاعر کے اتنے ہی اشعار میں سے اس قدر اچھے شعر نہیں نکل سکتے۔

غزل کے تمام لوازمات اقبال کی غزل میں موجود ہیں۔

غالب کا ایک شعر ہے۔

تماشا کر اے محو آئینہ داری تجھے کس تمنا سے ہم دیکھتے ہیں

اقبال اس مضمون کو یوں ادا کرتا ہے۔

مانا کہ تیری دید کے قابل نہیں ہوں میں — تو میرا شوق دیکھ مرا انتظار دیکھ

غالب تمنا کی مجسم تصویر بن کر اپنے محبوب سے ایک نگاہ التفات کی التجا کرتا ہے لیکن اقبال "مانا کہ تیری دید کے قابل نہیں ہوں میں" کہہ کر پہلے اپنی عاجزی اور خاکساری (جو عاشق صادق کی خصوصیات ہیں) کا اظہار کرتا ہے۔ وہ غالب کی طرح "تماشا کر" کہہ کر محبوب کو اپنی طرف راغب کرنے کو گستاخی سمجھتا ہے اس لئے اپنے شوق اور انتظار کی کیفیت کے ملاحظہ ہی کے لئے درخواست کر کے چپ رہ جاتا ہے۔

رند کا شعر ہے۔

دکھایا گنج قفس مجھ کو آب ودانے نے — وگرنہ دام کہاں، میں کہاں، کہاں صیاد

شاعر آب ودانے کی کشش کو اپنی گرفتاری کا سبب بتاتا ہے۔ لیکن اقبال اپنی گرفتاری کی کیا ہی انوکھی وجہ بتاتا ہے۔

پاس تھا ناکامی صیاد کا اے ہمصفیر — ورنہ میں اور اڑ کے آتا ایک دانے کے لئے

ہم اپنی آنکھوں سے دنیا کی چیزوں کو سطحی طور پر دیکھتے ہیں۔ ہماری بینائی کی رسائی مادی اشیاء تک محدود ہے، اگر اس کے علاوہ ہم غیر مادی چیزوں یا ان کی حقیقت کو دیکھنا چاہیں تو ہمیں اپنی باطنی آنکھوں کی بینائی درکار ہوگی۔ اس خیال کو درد دہلوی نے ایک رباعی میں ادا کیا ہے۔

اے درد! بہت کیا پر کھا ہم نے — دیکھا ہے یہی جہاں کا لیکھا ہم نے
جب آنکھ نہ تھی تو دیکھتے تھے سب کچھ — جب آنکھ کھلی تو کچھ نہ دیکھا ہم نے

اقبال نے اسی مفہوم کو ایک شعر میں یوں ادا کیا ہے۔

ہو دید کا جو شوق تو آنکھوں کو بند کر — ہے دیکھنا یہی کہ نہ دیکھا کرے کوئی

بیدل عظیم آبادی کا مشہور شعر ہے۔

باہر کمال اندکے آشفتگی خوش است ہر چند عقل کل شدۂ بے جنوں مباش!

اقبال نے اسی خیال کو کس شگفتہ اور سلیس طریقہ سے اور کتنی ترقی کے ساتھ پیش کیا ہے۔

اچھا ہے دل کے ساتھ رہے پاسبانِ عقل لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے!

میر کا ایک بے مثل شعر ہے۔

جو پوچھا کہ کتنا ہے گل کا ثبات؟ کلی نے یہ سن کر تبسم کیا!

اقبال کا یہ شعر۔

گل تبسم کہہ رہا تھا زندگانی کو مگر شمع بولی گریۂ غم کے سوا کچھ بھی نہیں

بھی میر کے شعر کے مفہوم کے لگ بھگ پہنچ جاتا ہے فرق صرف اتنا ہے کہ وہاں فرصت زندگی بقدر یک تبسم اور یہاں وہ گریۂ غم ہے۔

عاشق اپنے محبوب کا نام لے لے کر چیختا پھرتا ہے یہاں تک کہ شدت ضعف سے اس میں اپنے محبوب کی آواز پہ "لبیک" ! کہنے کی بھی سکت باقی نہیں رہتی کیونکہ وہ اپنی تمام قوت پکارنے میں صرف کر چکتا ہے اگر اس میں "لبیک" ! کہنے کی طاقت ہی باقی رہتی تو وہ ایک مرتبہ اور اپنے محبوب کو نہ پکار لیتا اس خیال کو اقبال یوں ادا کرتا ہے۔

صدائے لن ترانی سن کے اے اقبال میں چپ ہوں تقاضوں کی کہاں طاقت ہے مجھ آفت کے مارے میں

جوش اپنی ایک نظم میں کہتا ہے۔

صدا یہ دے رہا ہے طور سے کون کوئی کہدو مجھے فرصت نہیں ہے

ان دونوں شعروں کے مقابلے سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جوش کا انداز بیان رندانہ ہے اور اقبال کا عاشقانہ۔

غالب کا شعر ہے۔

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو اک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہیئے

اقبالؔ اسی خیال کو کتنی ترقی سے پیش کرتا ہے۔

غرض نشاط ہے شغل شراب سے جن کی ۔۔۔ حلال چیز کو گویا حرام کرتے ہیں

اقبالؔ اور غالبؔ شغل مے نوشی سے "نشاط" کی غرض کو قطعی ناجائز سمجھتے ہیں فرق صرف اتنا ہے کہ اقبالؔ کا انداز بیان زیادہ قائل کرنے والا اور مدلل ہے کیونکہ وہ شراب کو "حلال چیز" کہتا ہے لیکن حصول نشاط کو حرام قرار دیتا ہے۔ غالب بھی گو "نشاط" کو جائز نہیں سمجھتا تاہم اک گونہ بیخودی کو روا رکھتا ہے (اور یہ خود بھی نشاط کی ایک شکل ہے) لیکن اقبالؔ اس آتش سیال کو صرف آئینہ دل کے میل کو جلانے کے لئے جائز سمجھتا ہے اس سے کون انکار کرسکتا ہے کہ جو چیز انسان کو برائیوں سے بچائے اور اچھائیوں کی طرف مائل کرے وہ عین حلال ہے۔

میرؔ کا ایک اخلاقی شعر ہے۔

ہر دم قدم کو اپنے رکھہ احتیاط سے یاں ۔۔۔ یہ کارگاہ ساری دوکان شیشہ گر ہے

اقبالؔ انسان کو دنیا میں اس سے بھی زیادہ محتاط زندگی بسر کرنے کی تلقین کرتا ہے۔

زندگی کی رہ میں چل لیکن ذرا بچ بچ کے چل

یہ سمجھ لے کوئی مینا خانہ بار دوش ہے

" دوکان شیشہ گر" میں اگر انسان احتیاط سے چلے پھرے تو نقصان کا بہت ہی کم احتمال باقی رہ جاتا ہے لیکن جو شخص "مینا خانہ بدوش" ہو اس کے لئے تو ادنیٰ سی لغزش پا بھی بہت زیادہ نقصان دہ ثابت ہوگی۔

اقبال کی غزلوں میں جیسا کہ پہلے کہا جاچکا ہے متقدمین کی غزلوں کی طرح بیان حسن و عشق (تغزل)، پند و موعظت اور تصوف سب کچھ موجود ہے۔

تغزل

ہم اپنی دردمندی کا فسانہ ۔۔۔ سنا کرتے ہیں اپنے رازداں سے

میرے مٹنے کا تماشا دیکھنے کی چیز تھی ۔۔۔ کیا بتاؤں میرا ان کا سامنا کیونکر ہوا

میں انتہائے عشق ہوں تو انتہائے حسن
دیکھے مجھے کہ تجھ کو تماشا کرے کوئی

چمن زار محبت میں خموشی موت ہے بلبل
یہاں کی زندگی پابندی رسم فغاں تک ہے

زمانے بھر میں رسوا ہوں مگر اے وائے نادانی
سمجھتا ہوں کہ میرا عشق میرے رازداں تک ہے

مہینے وصل کے گھڑیوں کی صورت اڑتے جاتے ہیں
مگر گھڑیاں جدائی کی گزرتی ہیں مہینوں میں

محبت کے لئے دل ڈھونڈ کوئی ٹوٹنے والا
یہ وہ مے ہے جسے رکھتے ہیں نازک آبگینوں میں

خموش اے دل! بھری محفل میں چلانا نہیں اچھا
ادب پہلا قرینہ ہے محبت کے قرینوں میں

ترے عشق کی انتہا چاہتا ہوں
مگر سادگی دیکھ کیا چاہتا ہوں

ستم ہو کہ ہو وعدہ بے حجابی
کوئی بات صبر آزما چاہتا ہوں

ذرا سا تو دل ہوں مگر شوخ اتنا
وہی لن ترانی سنا چاہتا ہوں

کوئی دم کا مہماں ہوں اے اہل محفل
چراغ سحر ہوں بجھا چاہتا ہوں

کوئی دل ایسا نظر نہ آیا، نہ جس میں خوابیدہ ہو تمنا
الٰہی تیرا جہان کیا ہے! نگار خانہ ہے آرزو کا!!!
یہ رسم بزم فنا ہے اے دل! گناہ ہے جنبش نظر بھی
رہے گی کیا آبرو ہماری جو تو یہاں بیقرار ہوگا

آہ! دنیا دل سمجھتی ہے جسے وہ دل نہیں
پہلوئے انساں میں اک ہنگامہ خاموش ہے

پند و موعظت

اس گلستاں میں نہیں حد سے گزرنا اچھا
ناز بھی کر تو باندازۂ رعنائی کر

اے رہرو فرزانہ! رستے میں اگر تیرے
گلشن ہے تو شبنم ہو، صحرا ہے تو طوفاں ہو

کب تلک طور پہ دریوزہ گری مثل کلیم!
اپنی ہستی سے عیاں شعلۂ سینائی کر

پہلے خود دار تو مانند سکندر ہولے
پھر جہاں میں ہوس شوکت دارائی کر

نہیں ہے غیر از نمود کچھ بھی جو مدعا تیری زندگی کا
تو اک نفس میں جہاں سے مٹنا تجھے مثال شرار ہوگا
تمھاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا

بھلی ہے ہم نفسو! اس چمن میں خاموشی
کہ خوشنواؤں کو پابند دام کرتے ہیں

نہ ہو طبیعت ہی جن کی قابل وہ تربیت سے نہیں سنورتے
ہوا نہ سرسبز رہ کے پانی میں عکس سرو کنار جو کا

شبنم کی طرح پھولوں پہ رہ اور چمن سے چل
اس باغ میں قیام کا سودا بھی چھوڑ دے

لطف کلام کیا جو نہ ہو دل میں درد عشق
بسمل نہیں ہے تو تو تڑپنا بھی چھوڑ دے

گلزار ہست و بود نہ بیگانہ وار دیکھ!
ہے دیکھنے کی چیز اسے بار بار دیکھ!

تصوف

کھولی ہیں ذوق دید نے آنکھیں تری اگر
ہر رہگذر میں نقش کف پائے یار دیکھ

کچھ دکھانے دیکھنے کا تھا تقاضا طور پر
کیا خبر ہے تجھکو اے دل فیصلہ کیونکر ہوا

حسن کامل ہی نہ ہو اس بے حجابی کا سبب
وہ جو تھا پردوں میں پنہاں خودنما کیونکر ہوا

ظاہر کی آنکھ سے نہ تماشا کرے کوئی
ہو دیکھنا تو دیدۂ دل وا کرے کوئی

اگر کچھ آشنا ہوتا مذاق جبہ سائی سے
تو سنگ آستان کعبہ جا ملتا جبینوں سے

کبھی اپنا بھی نظارہ کیا ہے تو نے اے مجنوں!
کہ لیلیٰ کی طرح تو خود بھی ہے محمل نشینوں میں

بھڑک اٹھا کوئی تیری ادائے ماعرفنا پر
ترا رتبہ رہا بڑھ چڑھ کے سب ناز آفرینوں میں

مدام گوش بہ دل رہ یہ ساز ہے ایسا
جو ہو شکستہ تو پیدا نوائے راز کرے

تمیز لالہ و گل سے ہے نالہ بلبل!
جہاں میں وا نہ کوئی چشم امتیاز کرے

بزم ہستی اپنی آرائش پہ تو نازاں نہ ہو
تو تو اک تصویر ہے محفل کی اور محفل ہوں میں

پختہ ہوتی ہے اگر مصلحت اندیش ہو عقل
عشق ہو مصلحت اندیش تو ہے خام ابھی

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لب بام ابھی

کبھی اے حقیقت منتظر نظر آ لباس مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبین نیاز میں

تو بچا بچا کے نہ رکھ اسے، ترا آئینہ ہے وہ آئینہ
جو شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہ آئینہ ساز میں

یہ چند اشعار اقبال کی استادی (بحیثیت غزل گو) کی دستاویز ہیں جن پر زمانہ حیات دوام کی مہریں ثبت کر چکا ہے۔ زمانہ کا معیار صحیح اور فیصلہ اٹل ہے۔ وہ "کتنا لکھا"! نہیں پوچھتا بلکہ جانچتا ہے کہ "کیسا لکھا"!

پریم پرچار

میکش صاحب کی شاعرانہ زندگی مختصر سہی لیکن بیان کی وسعت بے پایاں نظر آتی ہے۔

ادارہ

دنیائے تصور میں خود کو کھویا کھویا سا پاتا ہوں
دن رات اداس گذرتی ہے سیلاب اشک بہاتا ہوں
دکھ جھیلتا ہوں، غم سہتا ہوں، سو طرح کے رنج اٹھاتا ہوں
لو آج زباں پہ لاتا ہوں
میں اپنی بپتا سناتا ہوں

کوشش کی بلندی دیتا ہوں پھر مجبوری کی پستی کو
شرمندۂ لغزش کرتا ہوں پھر بادۂ عشق کی مستی کو
اک بار بسانا چاہتا ہوں پھر دل کی اجڑی بستی کو
پھر چھیڑ کے بربط ہستی کو
میں پریم کا گیت سناتا ہوں

پھر زیست کو اپنی باندھتا ہوں میں رشتۂ عشق کے بندھن سے
پھر آنکھیں اپنی سینکتا ہوں میں آتش روئے روشن سے
پھر نکہت ناز اڑاتا ہوں حسن نیاز کے گلشن سے

پھر پریم کے امرت جیون سے
میں من کی پیاس بجھاتا ہوں

پھر پیت کی آگ نظر آتی ہے ہر دم ٹھنڈی آہوں میں
پھر یاد کیا کرتا ہوں تم کو پہروں خلوت گاہوں میں
پھر ایک کشش سی پاتا ہوں ہر بار تمھاری نگاہوں میں

پھر پریم نگر کی راہوں میں
میں تن من دھن کو لٹاتا ہوں

اک جوش جوانی پاتا ہوں پھر تار نفس کے ترانے میں
اک لطف تقدس ملتا ہے پھر فطرت کے میخانہ میں
اک آس سی بندھتی دیکھتا ہوں پھر بگڑی کے بنجانے میں

پھر دل کے ویراں خانے میں
میں شمع شوق جلاتا ہوں

میکش

انقلابِ زندگی

از

محمد یحییٰ صدیقی ایم - اے (عثمانیہ)

(۱)

حامد کی رُوح

حامد کا انتقال ہو چکا ہے شہر کا بچہ بچہ جانتا ہے کہ حامد کا انتقال ہو چکا ہے ۔ وہ لوگ اب بھی موجود ہیں جنھوں نے اپنے ہاتھوں سے اسے قبر میں اتارا ۔ اس کو مرے ہوئے عرصہ گزر گیا ۔ اتنا عرصہ کہ اس کی ہڈیاں بھی گل گئی ہوں گی ۔ میں اس کی موت پر اس قدر زور محض اس لئے دے رہا ہوں تاکہ آپ کو اس کا یقین ہو جائے ورنہ آپ اس قصہ سے لطف اندوز نہ ہو سکیں گے ۔ رشید کو جو حامد کا شریک کار تھا اس کی موت کا بیحد رنج ہوا سارا کام اس کے سر پڑ گیا ۔ بیچارے کی حالت قابل رحم تھی ۔

دوکان کے بورڈ پر اب تک دونوں کا نام موجود تھا "حامد رشید اینڈ کمپنی" یہ نام اس وقت لکھا گیا تھا جب دونوں نے مل کر کام شروع کیا تھا ۔ حامد کے انتقال کے بعد بھی کسی تبدیلی کی ضرورت نہیں سمجھی گئی ۔

رشید ایک کنجوس آدمی تھا ۔ اس کی زندگی کا واحد مقصد کمانا اور جمع کرنا تھا ۔ بے ایمانی ۔ عیاری دغابازی ۔ مکر و فریب کسی طرح اسے حصول زر میں عار نہ تھی ۔ وہ صرف کمانا اور جمع کرنا جانتا تھا ۔ خرچ کرنا نہیں

خوشامد۔ دھمکی کوئی طریقہ اس سے روپیہ حاصل کرنے کے لئے کارآمد نہ تھا۔ اس کی ہر بات ایک راز تھی۔ اسکی زندگی تنہائی میں گزرتی تھی وہ مذہب سے بیگانہ تھا۔ خدا اور رسول سے اسے کوئی تعلق نہ تھا۔ عید بقرعید سے اسے کوئی سروکار نہ تھا۔ اپنے کام سے کام۔ صبح ہوئی دُکان کھولی شام تک بیٹھا۔ شام کو دُکان بند کی اور گھر کی راہ لی۔ یہ اس کی زندگی کا معمول تھا اس کا دنیا میں کوئی دوست نہ تھا۔ آج تک میں نے کسی کو اسے راستے میں روک کر یہ کہتے نہیں سُنا "کیوں دوست رشید، تمہارا مزاج کیسا ہے"۔ وہ ایک سخت گیر آدمی تھا درشتی کی علامات چہرے سے نمایاں تھیں۔ اسی وجہ سے بچے اس سے گھبراتے، فقیر اس کے قریب آنے کی جرأت نہ کرتے۔ حتیٰ کہ کتے تک اسے دیکھ کر راستے سے ہٹ جاتے تھے مگر رشید کو اس کی کوئی پرواہ نہ تھی۔ یہ تو اسکی مرضی کے عین مطابق تھا۔ وہ حتی الوسع دنیا والوں سے دور ہی رہنا چاہتا تھا۔ اس کی دولت اسکی دلی تسکین کے لئے کافی تھی۔

ایک عید کی شام کا واقعہ ہے کہ رشید حسب معمول اپنی دُکان میں بیٹھا ہوا تھا۔ شام انتہائی سرد تھی۔ سردی کے مارے دانت بج رہے تھے۔ مطلع بھی کہر آلود تھا۔ گو اس وقت چار بجے تھے مگر اندھیرا ہو گیا تھا۔ کہر ہر لحظہ بڑھتی جا رہی تھی۔ مکانات و فاتر۔ گھنٹہ گھر ہر چیز نظروں سے چھپ گئی تھی۔ رشید کے مقابل اس کا منشی بیٹھا خطوط کی نقلیں کر رہا تھا۔

اسی وقت ایک آواز آئی "چچا جان کل عید ہے، خدا مبارک کرے"۔ یہ رشید کے بھتیجے سلیم کی آواز تھی جو اس سے ملنے آیا تھا۔

خاموش رہو کیا بیہودہ باتیں کر رہے ہو۔

کیا عید بیہودگی ہے۔ "عید مبارک ہو" کیوں۔ کس لئے تم غریب ہو۔ غریبوں کی عید کی کیا خوشی جو غریب عید کی خوشی مناتے ہیں وہ ایک ناقابل معافی غلطی میں مبتلا ہیں۔

مگر آپ تو دولت مند ہیں آپ کو غمگین رہنے کا کیا حق حاصل ہے آیئے تو عید کی خوشی منائیے ہمیں ہم بھی حصہ دار بن جائیں گے۔

چونکہ رشید کے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا۔ اس لئے ہونہہ "محض بیہودگی" کہہ کر خاموش ہوگیا۔

"چچا" جان غصہ میں نہ آئیے۔

"کیوں غصہ میں نہ آؤں، دنیا بیوقوفوں سے بھری ہوئی ہے، جسے دیکھو عید کا دیوانہ، جسے دیکھو عید کی خوشیاں منانے کو تیار، کوئی ان سے پوچھے کہ عید انھیں کیا دئے دے رہی ہے جو یہ اتنے خوش ہیں کیا ان کا قرضہ ادا ہوا جارہا ہے، یا انھیں کوئی جاگیر ملی جارہی ہے۔ برخلاف اس کے عید ان کے قرضے میں چند روپیوں کا اضافہ کردیتی ہے اس پر بھی خوشی میں کمی نہیں ہوتی۔ اگر میرا بس چلتا تو ہر اس شخص کو جو عید کی خوشی مناتا ہے، عید کی سویوں کے ساتھ اُبال دیتا۔"

چچا جان!

کیا ہے؟ جاؤ تم اپنے طریقہ پر عید مناؤ میں اپنے طریقہ پر مناؤں گا۔ جاؤ اور مجھے دق نہ کرو۔

آپ عید منائیں گے؟ مگر آپ تو عید مناتے ہی نہیں۔

نہ سہی تمھاری بلا سے۔ تم جاؤ اور عید کی خوشی مناؤ۔

دنیا میں بہت سی ایسی چیزیں ہیں جن سے مجھے کوئی فائدہ نہیں پہنچتا۔ منجملہ ان کے ایک عید بھی ہے۔ اس کے باوجود میں اس کا ہمیشہ منتظر رہتا ہوں۔ اس کی مذہبی اہمیت سے قطع نظر ایک مسرت آگیں دن کی حیثیت سے میں اس کا منتظر رہتا ہوں۔ یہ وہ دن ہوتا ہے جب دشمن دشمنی بھول جاتا ہے۔ دونوں کی کدورت دور ہوجاتی ہے۔ ہر شخص دوسرے کے گلے مل کر سارے رنج و غم کو بھلا دیتا ہے۔ اس لئے گو عید کی وجہ سے مجھے سونے کی کوئی اینٹ نہیں ملتی پھر بھی میں سمجھتا ہوں کہ اس سے مجھے فائدہ پہنچتا ہے اور اسی لئے میں اس کی آمد کا منتظر رہتا ہوں۔

منشی نے اس موقعہ پر بے ساختہ تالی بجادی۔ مگر جلد ہی وہ اپنی غلطی محسوس کرکے دوسری طرف متوجہ ہوگیا۔

اگر تم نے پھر ایسی حرکت کی تو اپنی ملازمت کھو کر عید مناؤ گے...... پھر اپنے بھتیجے سے مخاطب ہوکر

کہنے لگا تم بڑے اچھے مقرر ہو مجھے امید ہے کہ تم ایک کامیاب وکیل بن سکو گے۔

غصہ میں مت آئیے چچا جان۔ جانے دیجئے۔ اور ہاں۔ کل دوپہر کا کھانا ہمارے ہی ساتھ کھائیے

خیر دیکھا جائے گا...... دیکھا جائے گا۔

مگر آپ وعدہ کیوں نہیں کرتے چچا جان۔

میں تمھارے پاس آنا نہیں چاہتا۔ تم نے شادی کیوں کی۔

چچا جان۔ مجھے اس لڑکی سے محبت تھی۔

'محبت' رشید نے تمسخر آمیز لہجہ میں کہا۔ اچھا اب تم جاؤ۔

لیکن شادی سے پہلے بھی تو آپ کبھی میرے ہاں نہیں آئے۔ پھر شادی کے بعد نہ آنیکا بہانہ کیوں بنا رہے ہیں۔

اچھا اب جاؤ۔

میں آپ سے کوئی امید نہیں رکھتا۔ آپ سے کوئی چیز نہیں مانگتا پھر ہم دوست کیوں نہ بنے رہیں۔

اچھا اب جاؤ۔

مجھے یہ دیکھکر افسوس ہوتا ہے کہ آپ اپنی بات پر اڑے ہوئے ہیں میں آج تک آپ سے نہیں لڑا' آج عید کے طفیل میں آپ کو اپنا دوست بنانے آیا تھا۔ اور چونکہ عید کی مسرت آخر تک برقرار رکھنا چاہتا ہوں اس لئے میری مبارکباد قبول کیجئے۔

اچھا اب جاؤ۔

عید مبارک۔

جاؤ۔

غصہ کا ایک لفظ کہے بغیر وہ جانے کے لئے مڑا۔ لیکن پھر رک کر منشی کو مبارکباد دی اور چلا گیا۔

"اچھا ایک آدمی اور بھی ہے" رشید نے اپنے کلرک کا جواب سنکر کہا اس شخص کو دیکھو پچیس روپیہ ہوار پاتا ہے

جس سے ایک بڑے خاندان کی پرورش کرنی پڑتی ہے پھر بھی عید کی خوشی منا رہا ہے۔

سلیم کے جانے کے تھوڑی دیر بعد دو آدمی بغل میں رجسٹر اور کاغذات دبائے اس کی دوکان میں داخل ہوئے ان میں سے ایک نے فہرست میں حامد۔ رشید پڑھتے ہوئے دریافت کیا "کیا مجھے رشید صاحب سے گفتگو کا فخر حاصل ہے" یا حامد صاحب سے؟

آہ بیچارہ حامد۔ اس کو مرے ہوئے سات سال ہو گئے۔ یہی رات تھی جب اس کا انتقال ہوا۔

مجھے یقین ہے کہ اس کی سخاوت اس کے شریک کار کے حصے میں ضرور آئی ہوگی۔

سخاوت کا نام سن کر رشید کے چہرے پر غصہ کے علامات نمایاں ہو گئے مگر وہ صرف سر ہلا کر رہ گیا۔

سال کے ایسے مبارک دن کو ہر بنی نوع انسان کا یہ فریضہ ہونا چاہیئے کہ وہ ان غریبوں اور بیکسوں کی جنھیں کھانے کو سوکھے ٹکڑے اور پہننے کو چیتھڑے تک نصیب نہیں ہوتے۔ امداد کرے۔ رشید صاحب دنیا میں ایسے غریبوں کی کمی نہیں اور ان کی نگاہیں آپ جیسے دل والے حضرات کی طرف اٹھتی ہیں۔

غریبوں کی امداد۔ ایسے غریب جن کو کھانا تک میسر نہیں ان کو زندہ رہنے کا کوئی حق حاصل نہیں وہ لوگ سوسائٹی کے بار گراں ہیں۔ ان کو یوں ہی فاقوں مرجانا چاہیئے۔

ہم نے اس بار گراں کو اپنے سر پر لیا ہے کہ ایسے غریبوں کے لئے چندہ جمع کر کے ان کو مصیبتوں سے نجات دلائیں فرمائیے آپ کے نام پر کیا لکھا جائے۔

کچھ نہیں۔

کیا آپ اپنا نام ظاہر فرمانا نہیں چاہتے۔

میں تنہائی چاہتا ہوں اور یہی میرا جواب ہے۔ نہ میں عید کی خوشی مناتا ہوں نہ بیکاروں کو خوشی مناتے دیکھنا چاہتا ہوں۔

خیال فرمائیے کہ اگر ان کی امداد نہ کی گئی تو وہ مر جائیں گے۔

مر جانے دو۔ مجھے کیا فکر ہے۔ میری مصروفیات خود اسقدر زیادہ ہیں کہ میں ان چیزوں کیطرف

توجہ نہیں کر سکتا۔ اچھا اب آپ لوگ تشریف لیجائیے۔

یہ سوکھا جواب سن کر وہ دونوں اجنبی رخصت ہو گئے۔

تاریکی اور سردی لمحہ لمحہ بڑھ رہی تھی۔ بازاروں کا ہجوم چھٹ رہا تھا اور لوگ جلد سے جلد اپنے مکانوں کو پہنچ جانے کی کوشش کر رہے تھے۔ اتنے میں ایک فقیر نے حامد کی دکان پر صدا لگائی "عید کی خوشی میں بال بچوں کا صدقہ۔ ایک معذور کو بھی کچھ دلا دینا بابا۔" ان الفاظ کو سنتے ہی رشید نے اپنا رومال سنبھالا اور فقیر پر جھپٹا۔ فقیر اس آفت ناگہانی سے ڈر کر اپنی جان بچا کر بھاگا۔

سات بجے تھے جب رشید با دل ناخواستہ دکان بند کرنے کے ارادے سے اٹھا۔ یہ دیکھکر منشی بھی جانے کو تیار ہو گیا۔

غالباً کل تمھیں رخصت کی ضرورت ہو گی۔ رشید نے اپنے منشی سے دریافت کیا۔

اگر جناب اجازت دیں۔

میں اجازت نہیں دے سکتا۔ اگر تم نہ آئے تو میں تمھاری ایک دن کی تنخواہ کاٹ لینے پر مجبور ہونگا اور تم مجھے بڑا ہی سخت گیر خیال کرو گے۔ مگر مجھے اس کی پرواہ نہیں ہے۔ میں بلا کام کے تنخواہ دینا نہیں چاہتا۔

مگر جناب ایسا موقعہ سال میں ایک دو دفعہ ہی آتا ہے۔

گو یہ کوئی معقول عذر نہیں ہے۔ پھر بھی میں رعایت کرتا ہوں۔ مگر دیکھو پرسوں علی الصباح آجانا۔

منشی بہت اچھا کہہ کر دکان بند کرنے میں مصروف ہو گیا۔ دکان بند کرتے ہی اس نے کنجیاں رشید کے حوالے کیں اور انتہائی تیزی سے ایک طرف چلا گیا۔

رشید نے گھر جا کر حسب معمول کھانا کھایا۔ اخبارات دیکھے اور سونے کے کمرے میں چلا گیا۔ وہ ابھی لیٹا ہی تھا کہ اسے دروازے پر اپنے شریک کار حامد کا۔ ہاں مرحوم حامد جس کا ان گزشتہ سات سالوں میں خیال بھی نہ آیا تھا۔ چہرہ نظر آیا۔ یہ کوئی نظری دھوکہ نہ تھا۔ بلکہ بالکل واضح طور پر کمرے

دروازہ پر حامد کا چہرہ نظر آرہا تھا۔ چہرہ ہر قسم کے علامات سے قطعی عاری تھا۔ وہ رشید کو انہی نظروں سے دیکھ رہا تھا جن سے وہ اپنی زندگی میں دیکھنے کا عادی تھا چشمہ پیشانی پر چڑھا ہوا۔ آنکھیں غیر متحرک اسی وجہ سے چہرہ ایک حد تک ہیبتناک ہو گیا تھا۔

لیکن جب رشید نے دوبارہ غور سے دیکھا تو وہاں کچھ نہ تھا۔ رشید نہ گھبرایا نہ ڈرا بلکہ اسی طرح اطمینان سے لیٹا رہا۔ اس کے بعد مکان مختلف قسم کی آوازوں سے گونجنے لگا۔ لیکن رشید پر اس کا بھی کوئی اثر نہ ہوا کیونکہ وہ ایسی چیزوں کو خاطر میں لانے والا نہ تھا۔ کمرہ میں ایک گھنٹی لگی ہوئی تھی جو ایک زمانہ سے استعمال نہیں کی گئی تھی۔ یکایک وہ بجنے لگی۔ جب اس کی آواز بند ہوئی تو ایک عجیب قسم کی کھڑ کھڑاہٹ شروع ہوئی۔ یہ آواز قریب ہوتی گئی حتیٰ کہ اس نے اسے اپنے کمرے کے دروازے پر سنا۔ دروازہ کھلا اور حامد کی روح اس کی نظروں کے سامنے تھی۔ اپنے اسی لباس میں جو وہ ہمیشہ پہنا کرتا تھا۔ وہی میلی دقیانوسی شیروانی۔ وہی پیوند لگا پاجامہ۔ وہی پھٹی ہوئی گرگابی۔ زنجیروں سے جکڑا ہوا۔ غور سے دیکھنے پر رشید نے معلوم کیا کہ زنجیریں سونے کی اینٹوں۔ کنجیوں۔ قفلوں۔ چاندی اور تانبے کے سکوں سے بنی ہوئی ہے۔

کیوں؟ رشید نے اصولی سرد لہجہ میں کہا۔ "تم کیا چاہتے ہو"؟

"بہت کچھ" بلاشبہ آواز حامد ہی کی تھی۔

تم کون ہو؟

یہ پوچھو کہ تم کون تھے۔

اچھا تم کون تھے۔ رشید نے آواز کو بلند کرتے ہوئے پوچھا۔

زندگی میں میں تمھارا شریک کار تھا یعنی حامد۔

کیا تم بیٹھ سکتے ہو۔

کیوں نہیں۔

اچھا تو بیٹھ جاؤ۔

رشید کا خیال تھا کہ روح بیٹھ نہیں سکتی اسی وجہ سے اس نے یہ سوال کیا۔ کیونکہ نہ بیٹھ سکنے کی صورت میں ممکن تھا کہ روح توضیح سے بچنے کے لئے بھاگ کھڑی ہوتی۔ مگر روح بیٹھ گئی۔ رشید کے بالکل مقابل گویا وہ اس کی ہمیشہ سے عادی ہے۔

تم مجھ پر اعتقاد نہیں رکھتے۔

نہیں۔

لیکن میری موجودگی سے زیادہ تم کونسا ثبوت چاہتے ہو۔

یہ میں خود نہیں جانتا۔

کیا تم کو اپنے حواس پر بھی اعتبار نہیں۔

نہیں۔ کیونکہ وہ معمولی سے واقعہ سے متأثر ہوسکتے ہیں۔ پیٹ کی ذراسی خرابی اسے پریشان کرسکتی ہے اور ممکن ہے کہ تم اسی کی پیداوار ہو۔

رشید اس وقت انتہائی کوشش کر رہا تھا کہ اس قوت کو جو روح کی نظر سے اس پر رفتہ رفتہ متولی ہو رہی تھی دور کرے۔ ایک مرتبہ اس نے روح کی نظر کو اپنے چہرے پر سے ہٹانے کے لئے پوچھا۔ کیا تمھیں یہ آئینہ نظر آرہا ہے؟

ہاں۔

تم اس کی طرف نہیں دیکھ رہے ہو۔

اس کے باوجود وہ مجھے نظر آرہا ہے۔

بیہودگی۔ محض بیہودگی۔

یہ سُن کر روح نے ایک چیخ ماری۔ زنجیروں کو اس دہشتناک طریقہ پر کھڑکھڑایا کہ ڈر کے مارے رشید نے اپنا مُنہ تکیہ کے نیچے چھپا لیا۔ لیکن اس کی دہشت کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا جب روح نے اپنا ڈھاٹا کھول دیا اور اس کا نچلا جبڑا اس کے سینہ پر لٹک گیا۔ رشید اپنے گھٹنوں کے بل گر پڑا اور اپنا مُنھ ہاتھوں سے

چھپا لیا۔

رحم کرو۔ میرے حال پر رحم کرو۔ تم مجھے کیوں ستا رہے ہو۔

اے دنیا پرست کیا تجھے مجھ پر اعتقاد نہیں ہے؟

ہے! میں مجبور ہوں کہ تمہارا قائل ہوں۔ لیکن روحیں کیوں زمین پر چلتی ہیں۔ وہ میرے پاس کیوں آتی ہیں یہ انسان پر لازم ہے کہ وہ اپنے ہم جنسوں میں پھرتا رہے اور دور کا سفر کرے۔ اگر وہ ایسا نہ کرے تو مرنے کے بعد اسے ایسا کرنا پڑے گا۔ وہ مجبور ہوگا کہ ساری دنیا کا چکر لگائے۔ آہ میں کتنا بدنصیب ہوں۔ اور ایسی چیزوں کا مطالعہ کرے جس میں وہ حصہ دار نہیں بن سکتا۔ حالانکہ زندگی میں وہ اس پر قادر تھا۔ اتنا کہکر روح نے پھر ایک چیخ ماری۔ زنجیروں کو کھڑکھڑایا اور اپنے ہاتھوں کو ملنے لگا۔ یہ زنجیر خود میں نے تیار کی ہے۔ کڑی۔ کڑی۔ گز۔ گز۔ میں اسے تیار کرتا رہا۔ میں نے اسے اپنی خوشی سے پہنا ہے۔

رشید مارے خوف کے کانپنے لگا۔

آہ کاش تم کو معلوم ہوتا کہ وہ زنجیر جو تم پہننے والے ہو کتنی لانبی اور کتنی وزنی ہے۔ سات عیدوں سے پہلے وہ اتنی ہی وزنی اور اتنی ہی لانبی تھی جتنی کہ میری زنجیر ہے اس کے بعد برابر اس کو بڑھاتے رہے .... وہ انتہائی وزنی زنجیر ہے۔

رشید نے اس خیال سے اپنے چاروں طرف دیکھا کہ شاید وہ زنجیر نظر آجائے۔ لیکن اسے کچھ دکھائی نہ دیا۔

حامد پیارے حامد۔ مجھے اور باتیں بتاؤ۔ مجھ سے تسلی آمیز باتیں کرو۔

میں کچھ نہیں بتا سکتا۔ یہ دوسروں کا کام ہے۔ میرا نہیں مجھے بہت تھوڑی مہلت دی گئی ہے۔ میں آرام نہیں لے سکتا۔ رک نہیں سکتا۔ ٹھہر نہیں سکتا۔ میں اپنی زندگی بھر مکان اور دکان کے علاوہ کہیں نہیں گیا۔ اس لئے مجھے طول طویل سفر کرنے پڑ رہے ہیں۔

رشید سوچ میں پڑ گیا...... پھر کہنے لگا۔ حامد تم بہت سستی کرتے ہو گے۔

سستی!

سات سال سے برابر سفر۔

ہاں ایک ایک منٹ۔ نہ امن نہ آرام۔ اپنے کئے کی ندامت کی بے انتہا تکلیف۔

تم بہت تیز سفر کرتے ہو۔

ہوا سے زیادہ تیز

سات سال میں تم نے بہت فاصلہ طے کر لیا ہو گا۔

روح نے پھر ایک چیخ ماری۔ زنجیروں کو کھڑکھڑایا اور یوں گویا ہوئی۔ آہ قیدی۔ زنجیروں میں جکڑا ہوا۔ معلوم ہے کہ ندامت کا کوئی درجہ زندگی کی ان مواقع کا جو بُری طرح ضائع کر دئیے گئے بدل نہیں ہو سکتا

لیکن تم تو ایک اچھے کاروباری تھے۔ رشید نے لکنت آمیز لہجہ میں کہا...... کیونکہ وہ ان باتوں کو خود پر منطبق کر کے دیکھ رہا تھا۔

روح نے ہاتھوں کو ملتے ہوئے حقارت سے کہا۔ کاروبار۔ نوع انسانی میرا کاروبار تھی۔ ان کو لوٹنا میرا کام تھا۔ فلاح عامہ سے مجھے کوئی سروکار نہ تھا۔ حسد، ظلم، انتقام میرے کاروبار تھے۔ میرے تجارتی معاملات میرے کاروبار کے وسیع سمندر کا ایک قطرہ تھے...... سال کے اس موقع پر مجھے سب سے زیادہ تکلیف اٹھانی پڑتی ہے۔ میں اپنے ہم جنسوں میں کیوں نظریں نیچی کئے چلتا رہا۔ اور کبھی اس ستارہ کی طرف نہ دیکھا جو عقلمندوں کو غریبوں کے جھونپڑیوں کی طرف لیجاتا ہے۔ کاش دنیا میں وہ غریب نہ ہوتے جن کے پاس اس کی روشنی مجھے لیجانے والی تھی۔

اب رشید پر بجائے روح کے خوف کے ایک دوسرے قسم کا خوف غالب آ رہا تھا۔ وہ پہلے سے زیادہ کانپنے لگا۔

ادھر سنو میرا وقت تقریباً ختم ہو چکا ہے۔

میں سو رہا ہوں مگر مجھ پر سختی نہ کرو۔

میں یہ نہیں بتا سکتا کہ میں تمھارے سامنے مرئی صورت میں کیسے ظاہر ہوا۔ میں دنوں تمھارے پاس غیر مرئی حالت میں بیٹھا رہا ہوں . . . . . . آج رات یہاں اس لئے آیا ہوں کہ تمھیں تنبیہ کر دوں کہ ابھی تمھارے لئے موقع باقی ہے کہ میرے حشر سے بچ سکو۔

تم ہمیشہ اچھے دوست ثابت ہوئے ہو۔ میں تمھارا مشکور رہوں۔

تین روحیں تمھارے پاس آئینگی۔

یہ سُنکر رشید کا رنگ فق ہو گیا اور وہ کہنے لگا "حامد کیا تم اسی امید اور موقعہ کا ذکر کر رہے ہو"

ہاں۔

ایسی صورت میں میں موجودہ حالت کو ترجیح دوں گا۔

بغیر ان سے ملے تم اس راستہ سے نہیں ہٹ سکتے جس پر کہ میں چل چکا ہوں۔ کل ایک بجے ایک کے منتظر رہو۔

حامد کیا سب ایک ساتھ نہیں آسکتیں کہ جلد سے جلد تصفیہ ہو جائے۔

دوسری کا دوسری رات اسی وقت انتظار کرو۔ اور تیسری کا تیسری رات بارہ بجے . . . . . اب مجھ سے ملنے کی امید مت رکھو۔ اپنے حالات کا خیال کرو۔ —— جو کچھ میں نے کہا ہے یاد ہے نا۔

اتنا کہہ کر روح نے ڈھاٹا باندھا۔ دانتوں کے ملنے کی آواز کمرہ کی خاموش فضا کو توڑتی ہوئی رشید کے کانوں تک پہنچی تو اس نے اوپر دیکھنے کی جرأت کی اور روح کو اسی حال میں پایا جس حال میں اسے داخل ہوتے وقت دیکھا تھا۔ روح نے آہستہ آہستہ کھڑکی کی طرف بڑھنا شروع کیا اور رشید کو بھی آنے کی ہدایت کی۔ جب دونوں کے درمیان دو قدم کا فاصلہ رہ گیا تو اس کو روک دیا اور خود کھڑکی کی راہ سے غائب ہو گئی۔ رشید نے بھی کھڑکی کے باہر جھانکا مگر گھٹا ٹوپ اندھیرے کی وجہ سے کچھ دکھائی نہ دیا۔ البتہ ایسا معلوم ہوا گویا ساری فضا روحوں سے بھری ہوئی ہے۔ اور وہ سب کی سب حامد کی طرح

زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہیں۔ اس لئے کھڑکی بند کردی۔ دروازہ کو دیکھا تو وہ بند تھا۔ اس نے حسب عادت بیہودگی کی باتیں کہنے کا ارادہ کیا مگر نہ کہہ سکا۔ وہ پھر بستر پر لیٹ گیا اور تھوڑی ہی دیر میں دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو گیا۔

(۲)

پہلی روح سے ملاقات

جب رشید بیدار ہوا تو ویسی ہی تاریکی تھی جیسی اس کے سونے سے پہلے تھی۔ کمرہ کی کوئی چیز نظر نہ آتی تھی۔ ابھی وہ اس تاریکی میں دیکھنے کی کوشش ہی کر رہا تھا کہ قریب کے گھنٹہ گھر نے بارہ بجائے۔ رشید حیرت سے اچھل پڑا میں! کیا یہ ممکن ہے! کیا ایسا ہو سکتا ہے! مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں دو بجے سویا اور اب بارہ بجے ہیں گویا میں پورا دن اور رات کے اس حصہ تک سوتا رہا۔ وہ منھ ہی منھ میں بڑبڑانے لگا اس نے خیال کیا کہ شاید گھنٹہ گھر کی گھڑی غلط ہو مگر اس کا خیال غلط تھا کیوں کہ اسی وقت اس کے کمرے کی گھڑی نے بارہ بجائے۔ پھر اسے خیال آیا ممکن ہے دن کے بارہ بجے ہوں مگر کسی وجہ سے کمرے میں تاریکی ہو۔ وہ اٹھا اور ٹٹولتا ہوا کھڑکی تک پہنچا اور اسے کھولا۔ باہر بھی ویسی ہی غضب کی تاریکی تھی۔ سردی بھی شدت کی تھی۔ سڑک پر کسی کے چلنے پھرنے کی آواز نہیں آرہی تھی۔ اس نے کھڑکی بند کی اور جا کر بستر پر لیٹ گیا۔ وہ رات کے واقعات پر غور کرنے لگا مگر وہ جتنا غور کرتا اتنی ہی پیچیدگی بڑھتی جاتی یکایک اسے خیال آیا کہ ایک بجے اس سے ایک روح ملنے آنے والی ہے۔ بس اس نے اس کی آمد تک جاگنے کا تہیہ کر لیا۔ مگر ایسا معلوم ہو رہا تھا گویا وقت کی روانی رک گئی ہے ایک ایک منٹ ایک ایک سال کے برابر طویل معلوم ہو رہا تھا۔ خدا خدا کر کے کسی طرح وقت کٹا۔ ایک بجتے ہی کمرہ میں ایک خاص قسم کی روشنی نظر آئی اور کسی نے اس کے مچھردان کو ایک طرف ہٹایا۔ رشید اس وقت ایک غیر ارضی مخلوق کے سامنے تھا۔ روح کسی بڈھے کی معلوم ہو رہی تھی جو کسی آسمانی قوت سے بچے کی ہیئت میں تبدیل کردی گئی تھی۔

اس کے سر کے بال سفید تھے لیکن چہرے پر ایک جھری تک نہ تھی بلکہ ایک قسم کی تازگی تھی۔ بازو لانبے اور گٹھے ہوئے۔ پیر نازک تھے سفید گون پہنے اور کمر کے گرد پٹکا لپیٹے ہوئے تھی۔ سر سے روشنی کی شعاعیں نکل رہی تھیں۔

کیا تمھیں وہ روح ہو جس کے آنے کی مجھے اطلاع دی گئی تھی۔

ہاں! آواز نرم و شیریں۔ مگر بہت ہی پست تھی۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا گویا کوئی بہت دور بول رہا ہے

تم ہو کون؟

میں عید ماضی کی روح ہوں۔

کیا ماضی بعید کی۔

نہیں بلکہ تمھارے ماضی کی۔

رشید نے روح سے درخواست کی کہ وہ ٹوپی پہن لے۔

کیا؟ کیا تم میری روشنی کو اپنے دنیاوی ہاتھوں سے اسقدر جلد گل کر دینا چاہتے ہو؟ کیا یہ کافی نہیں ہے کہ تم ان لوگوں میں سے ایک ہو جن کے جذبات نے یہ ٹوپی بنائی اور سالہا سال تک مجھے اس کے پہنے رہنے پر مجبور کیا۔

رشید نے اظہار افسوس کرتے ہوئے اس کے آنے کا مقصد دریافت کیا۔

میں تمھاری بہبودی کے لئے آئی ہوں اٹھو اور میرے ساتھ چلو۔

چونکہ کوئی عذر پیش کرنا فضول تھا اس لئے رشید کھڑا ہو گیا۔ مگر اسے کھڑکی کی طرف جاتا دیکھ کر ٹھہر گیا اور کہنے لگا۔

میں کھڑکی کے راستے کیسے جا سکتا ہوں۔ ادھر گر جانے کا اندیشہ ہے۔

تم میرا ہاتھ پکڑ لو پھر کوئی اندیشہ نہ رہے گا۔

اس کے بعد دونوں کھڑکی کے باہر نکل گئے۔ اور رشید نے خود کو ایک گاؤں کی سڑک پر

کھڑا پایا۔

نہیں! یہ تو وہی جگہ ہے جہاں میں پیدا ہوا۔ اور جہاں میرا بچپن گزرا۔

تم کو یہاں کے راستے معلوم ہیں۔

اچھی طرح سے۔

اچھا تو چلو۔

انھوں نے چلنا شروع کیا۔ رشید ہر ہر چیز کو اچھی طرح پہچانتا تھا۔ چلتے چلتے ان کو ایک گاؤں نظر آیا جہاں بازار لگا کرتا تھا کچھ ٹٹو۔ بچوں سے بھری ہوئی کچھ گاڑیاں ان کی طرف آرہی تھیں۔ لڑکے ایک دوسرے کو پکار رہے تھے اور بڑے خوش معلوم ہوتے تھے۔

یہ زمانۂ گذشتہ کی چیزوں کا عکس ہے۔

رشید نے ان لڑکوں کو بھی پہچانا۔ اسے ان لڑکوں کو دیکھ کر کیوں خوشی ہو رہی تھی۔ جب وہ ایک دوسرے کو عید کی مبارکباد دیتے تو اس کا دل کیوں اچھلنے لگتا تھا۔ عید سے اسے کیا غرض تھی! کیا فائدہ تھا؟ .. ــــــ گاؤں کا مدرسہ بند تھا مگر ایک لڑکا جسے اس کے دوست احباب بھول گئے تھے وہاں موجود تھا...... رشید نے اسے بھی پہچان لیا...... چلتے چلتے وہ ایک بڑے مکان کے پاس پہنچے اور اس میں داخل ہو گئے۔ ایک کمرے میں ایک لڑکا اکیلا بیٹھا پڑھ رہا تھا۔ یہ رشید کے بچپن کا عکس تھا اسے دیکھ کر اس کے آنسو نکل آئے اور اپنی حالت زار پر افسوس کرتے ہوئے کہا "اے کاش" اور جیبوں کو ٹٹولنے لگا۔

کیا معاملہ کیا ہے۔

کچھ نہیں کچھ نہیں...... ایک لڑکا میرے دروازہ پر بھیک مانگتا ہوا آیا۔ عید کا صدقہ میں سوچ رہا ہوں کہ کاش میں نے اسے کچھ دے دیا ہوتا۔

'خیر آئندہ عید کو سہی' روح نے مسکراتے ہوئے کہا۔

اس کے عکس نے پڑھنا چھوڑ کر کمرہ میں ٹہلنا شروع کیا۔ رشید نے پہلے روح کی طرف اور پھر دروازہ کی طرف دیکھا ... کمرہ کا دروازہ کھلا اور ایک لڑکا عمر میں عکس سے بھی چھوٹا کمرے میں داخل ہوا اس نے اپنے ننھے ننھے ہاتھ عکس کے گلے میں ڈال دئے اور بڑے پیار سے کہا" بھائیجان میں تمھیں لینے آیا ہوں" لڑکا بیحد خوش تھا۔ تمھیں گھر لیجانے آیا ہوں۔ پیارا گھر۔ عزیز گھر

گھر۔ حمید مجھے گھر لیجانے آئے ہو ۔

ہاں آپ کو۔ اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے۔ اس کی طبیعت اب بالکل بدل گئی ہے ۔ وہ ہم لوگوں پر بیحد مہربان ہیں۔ ہمارا گھر جنت کا نمونہ بنا ہوا ہے ۔ انہی نے مجھے تمھیں لینے کو بھیجا ہے ۔ اور اب وہ کبھی تمھیں یہاں نہیں بھیجیں گے ۔عید ہمارے ساتھ گزارنا۔ پھر وہ تمھیں کام سکھنے کے لئے بھیجنے والے ہیں ۔ اتنا کہہ کر وہ اسے کھینچتا ہوا دروازہ کی طرف لے چلا ۔

رشید کا صندوق نیچے لے آؤ۔ ایک کرخت آواز آئی ۔ اس کے بعد بورڈنگ کا منتظم خود کمرے میں داخل ہوا ۔ مگر اس وقت وہ کیسا شریف اور کیسا نیک معلوم ہورہا تھا۔ اس نے دونوں بچوں سے ہاتھ ملایا اور ان کو رخصت کردیا ۔

کیسے وسیع دل کا مالک ہے ۔

واقعی اس کا دل بہت بڑا تھا۔ تم سچ کہتے ہو ۔

غالباً اس کا انتقال ہوا ہے ۔مگر اس کی اولاد ہے ۔

ہاں ایک لڑکا۔

یعنی تمھارا بھتیجا ۔

رشید اس وقت بیحد پریشان تھا اس لئے وہ صرف "ہاں" کہہ کر خاموش ہوگیا۔

یہاں سے نکل کر دونوں ایک شہر میں پہنچے ۔شام کا وقت تھا۔ روشنی جل چکی تھی۔ عید کی شام ہونے کی وجہ سے بازاروں میں کافی چہل پہل تھی روح ایک دکان کے سامنے ٹھیر گئی اور پوچھا۔ کیا تم

اس دُکان کو پہچانتے ہوئے

اس دُکان کو اچھی طرح سے ہمیں تو ہیں کام سیکھا کرتا تھا ...... وہ اندر داخل ہوئے بڈھے مراد کو دیکھ کر رشید کو بڑی حیرت ہوئی ۔ مراد نے جواب تک لکھنے میں مصروف تھا۔ قلم رکھ دیا۔ گھڑی دیکھی سات بج چکے تھے ..... اس نے آواز دی ..... رشید ..... محمود ۔ رشید کا نوجوان عکس اور محمود تیزی سے کمرے میں داخل ہوئے ۔ ان کو دیکھ کر مراد نے کہا ' چونکہ آج عید کی شام ہے اس لئے یہ دُکان بند کردی جائے گی ..... ذرا تمام چیزیں جماکے تو رکھ دو ۔

دونوں نے کمرہ کی تمام چیزوں کو احتیاط سے باندھ کر رکھ دیا ۔

اچھا! کل تم لوگوں کے آنے کی ضرورت نہیں ۔ اور یہ لو پانچ پانچ روپیہ شاید تمھیں ضرورت ہو میں چلتا ہوں ۔ تم دُکان بند کر کے کنجیاں مجھے دیتے ہوئے چلے جانا .... خدا حافظ ۔

روح نے رشید کو دونوں شاگردوں کی باتوں کی طرف متوجہ کیا دونوں مراد کی تعریف کر رہے تھے ۔ پھر کہنے لگی ۔

اس نے کوئی مہربانی نہیں کی ۔ اگر کل تعطیل دے دی یا پانچ پانچ روپئے دیدیئے تو کیا کمال کیا اس کے لئے وہ تعریف کا مستحق نہیں ہو سکتا ۔

تمھارا خیال کدھر ہے ۔ ہم کو خوش یا ناخوش رکھنا بالکل اس کے ہاتھ میں ہے ۔ فرض کرو چھٹی نہ دیتا تو ہم کیا کر سکتے تھے ۔ اس کا ہر حکم قطعی ہے ۔ اس کے باوجود ہمارے ساتھ کتنی شفقت سے پیش آتا ہے ہمیں اس کا ممنون ہونا چاہیئے اور .... لیکن یہ محسوس کر کے کہ روح اس کی طرف دیکھ رہی ہے خاموش ہو گیا ۔

کیا بات ہے ۔

کوئی خاص بات نہیں ۔

کچھ نہ کچھ تو ضرور ہے ۔

نہیں میں صرف یہ سوچ رہا تھا کہ کاش اس وقت میں اپنے منشی سے ایک دو باتیں کہہ سکتا اور بس !

چونکہ روح کا وقت ختم ہو رہا تھا اس لئے اسے جلدی تھی...... رشید نے پھر ایک مرتبہ اپنے عکس کو دیکھا۔ جوانی رخصت ہو چکی تھی۔ گو چہرہ پر وہ خشونت نہ آئی تھی جو اس وقت موجود تھی۔ تاہم اس کے اثرات نمایاں ہونے لگے تھے۔ آنکھوں سے حرص و ہوس نمایاں تھی۔ یہاں وہ تنہا نہ تھا۔ بلکہ اس کے ساتھ ایک عورت بھی تھی۔

تمھیں کیا پرواہ ہے۔ تمھیں کیا خبر ہے کہ مجھ پر کیا گزر رہی ہے۔ تم کو دنیا کا خوف بہت زیادہ ہو گیا ہے۔ تمھارے سارے جذبات صرف اس کوشش میں کہ اس کا ہاتھ تم تک پہنچ سکے فنا ہو گئے ہیں شریفانہ جذبات سرد پڑ چکے ہیں اور صرف کمانے کا جذبہ تم پر مستولی ہو گیا ہے۔

اس سے تم کو کیا۔ اگر زمانہ نے مجھے زیادہ عقلمند بنا دیا ہے تو تعجب کی کیا بات ہے۔ مگر تمھارے لئے تو میں وہی ہوں۔

عورت نے اپنا سر ہلا یا۔

کیا میں جھوٹ کہہ رہا ہوں۔

ہمارا معاہدہ بہت پرانا ہے۔ یہ اس وقت ہوا جب میں اور تم دونو غریب تھے اور غربت میں مطمئن۔ مگر ہم کو امید تھی کہ آئندہ چل کر دولت مند بن جائیں گے۔ جب ہم دولت مند بن گئے تو تمھارا طرز عمل بدل گیا۔ جب معاہدہ ہوا تھا تو تم بالکل مختلف تھے۔

اس وقت میں ناسمجھ تھا۔

خود تمھارے جذبات کہہ رہے ہیں کہ جو کچھ تم تھے اب نہیں ہو۔ میں وہی ہوں۔ جسنے اسوقت مسرت کا وعدہ کیا جبکہ ہمارے دل ایک تھے۔ اور جواب علیحدہ ہو جانے کی وجہ سے ٹوٹ چکا ہے۔ میں نہیں کہہ سکتی میں نے کس شدت سے اس کو محسوس کیا ہے۔

اس کے باوجود کیا میں نے کبھی تم سے علیحدہ ہونے کی کوشش کی۔

لفظاً نہیں کبھی نہیں۔

پھر کیسے۔

بدلی ہوئی طبیعت سے۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ جب یہ حقیقت آشکار ہوئی تو مجھ پر کیا گزری میں جانتی ہوں کہ اب میں تمھارے لئے ایک بار ہوں میں اس محبت کی خاطر جو کبھی ہم میں تھی، کہیں چلی جاؤں گی بتا کہ تم اطمینان سے پیسہ جمع کرسکو۔

رشید نے کچھ کہنا چاہا مگر عورت نے اُسے روک کر کہنا شروع کیا۔ مجھے امید ہے کہ واقعات گزشتہ کو یاد کر کے تم افسوس کروگے۔ مگر صرف عارضی طور پر....... خدا کرے کہ تم اپنی پسند کی ہوئی زندگی میں شاد کام رہو........ یہ کہہ کر وہ تیزی سے کمرہ سے نکل گئی۔ اے روح اب خدا کے لئے مجھے کچھ اور نہ دکھاؤ........ مجھے گھر لے چلو........ مجھے دکھ دیکر تمھیں کیوں خوشی ہوتی ہے۔

صرف ایک نظارہ اور...... اور بس۔

نہیں! نہیں!۔ ایک بھی نہیں۔ میں اب دیکھنا نہیں چاہتا۔ مجھے کچھ نہ دکھاؤ۔

مگر روح نے اسے یہ دیکھنے پر مجبور کر دیا کہ اس کے بعد کیا ہوا۔ وہ اسے ایک کمرہ میں لے گئی جو نہ بہت بڑا ہی تھا اور نہ خوبصورت مگر آرام دہ ضرور تھا' یہاں ایک خوبصورت لڑکی بیٹھی ہوئی تھی۔ یہ لڑکی اس عورت سے جس کو رشید ابھی دیکھ چکا تھا اس قدر مشابہ تھی کہ اس نے خیال کیا شاید وہی ہے۔ مگر اس کو اس نے فوراً ہی دیکھ لیا۔ وہ اپنی لڑکی کے مقابل بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے سر کے بال سفید ہو چکے تھے چہرے پر جھریاں پڑی ہوئی تھیں اور پہلے سے کچھ موٹی بھی ہوگئی تھی...... ان دونوں کے علاوہ کمرے میں اور بچے بھی تھے جو شور و غل مچا رہے تھے۔ ماں بیٹیاں اس ہنگامہ سے بیحد خوش ہو رہی تھیں۔ تھوڑی دیر بعد لڑکی بھی اٹھی اور بچوں کے ساتھ کھیلنے لگی۔

دروازہ پر کسی نے دستک دی۔ بچوں نے دوڑ کر دروازہ کھولا اور اپنے باپ سے (کیونکہ

آنیوالا ان کا باپ ہی تھا) لپٹ گئے آنے والے کے ساتھ ایک مزدور بھی تھا جو بچوں کے کپڑے اور کھلونوں کے پارسل اٹھائے ہوئے تھا۔ بچوں نے اپنے اپنے کپڑے لے لئے۔ اور انتہائی مسرت کے عالم میں کمرے میں کودنے لگے۔ بچوں کی اس وقت کی خوشی دیکھنے کے قابل تھی۔ وہ اس خوشی میں کھانا بھی بھول گئے اور صبح کی مسرتوں کے خیال میں بہت جلد سو گئے۔

آنے والا بھی اپنی بیوی اور لڑکی کے مقابل بیٹھ گیا........ رشید کا دماغ اس وقت خیالات کا آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اگر وہ بے رخی نہ برتتا۔ دولت کی تلاش میں اپنے حقوق نہ بھول جاتا تو ممکن تھا کہ یہی لڑکی اس کو ابا کہکر پکارتی ...... ایسی لڑکی کا باپ ہونا بھی کیسی خوشی کی بات ہے ......لڑکی اس ضعیفی میں اس کا سہارا ہوتی۔ اس کے غم کے لمحات کو اپنی محبت سے مسرتوں سے بدلدیتی ....بیساختہ اس کے منھ سے ایک آہ نکل گئی۔

آنے والے نے بوڑھی عورت سے مخاطب ہوکر مسکراتے ہوئے کہا آج میں نے تمھارے ایک پرانے دوست کو دیکھا۔

میرا دوست۔ میں سمجھی نہیں آپ کس کے متعلق کہہ رہے ہیں۔

پہچانو۔

میں کیسے پہچان سکتی ہوں۔ پھر یکایک جیسے کوئی خیال آگیا ہو۔ رشید تو نہیں۔

ہاں رشید ہی۔ میں اس کی دوکان کے پاس سے گزرا۔ اور اسے وہاں بیٹھا ہوا دیکھا۔ سنا ہے کہ اس کا ساتھی بستر مرگ پر پڑا ہوا ہے اس لئے وہ اکیلا ہی تھا...... بیچارہ دنیا میں اکیلا ہی ہے۔

اے روح مجھے یہاں سے لے چل۔ رشید نے گلوگیر آواز میں کہا۔

میں تم سے کہہ چکی ہوں کہ یہ گذشتہ واقعات کا عکس ہے۔ یہ واقعات کسی زمانہ میں گذر چکے ہیں ان کے لئے تم مجھے متہم نہ کرو۔

آہ! مجھے یہاں سے لے چلو۔ میں برداشت نہیں کرسکتا...... اس نے روح کی طرف دیکھا اور

وہاں اسے ان تمام چہروں کا جنھیں وہ دیکھ چکا تھا عکس نظر آیا۔

مجھے واپس لے چلو۔ مجھے چھوڑ دو۔ اور پھر کبھی میرے پاس نہ آؤ...... رشید نے محسوس کیا کہ روح کی روشنی پہلے سے زیادہ تیز اور واضح ہوگئی ہے۔ اس نے جھپٹ کر اس کی ٹوپی لے لی اور اس کے سر پہ رکھدی۔ روشنی کی شعاعیں ٹوپی میں سے نکل رہی تھیں مگر رفتہ رفتہ روشنی مدھم ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ بالکل غائب ہوگئی۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ اپنے بستر پر پڑا ہوا ہے۔ قبل اس کے کہ وہ واقعات پر غور کرے نیند نے اسے اپنی آغوش میں لے لیا۔

(۳)

دوسری روح سے ملاقات

رشید پھر جب سوکر اٹھا تو وہی ایک بجا تھا۔ گویا کسی نے خاص طور پر اسے دوسری روح سے ملاقات کرنے کے لئے اٹھادیا تھا۔ اس نے اپنا مچھردان علٰحدہ کردیا تاکہ روح کو اٹھانے کی تکلیف نہ گوارا کرنی پڑی اور اس کا انتظار کرنے لگا۔

ایک بج چکا تھا مگر روح کا کہیں پتہ نہ تھا۔ پانچ منٹ۔ دس منٹ۔ پاؤ گھنٹہ گزر گیا۔ مگر روح اب بھی نہ آئی۔ یکایک اسے کمرے میں ایک خاص قسم کی روشنی نظر آئی۔ مگر وہ نہ سمجھ سکا کہ یہ کہاں سے آرہی ہے اسے خیال گزرا کہ شاید باہر کے کمرے سے آرہی ہو۔ اس لئے اٹھکر دیکھنے کا ارادہ کیا۔ جونہی اس نے دروازہ پر ہاتھ رکھا کسی نے اس کا نام لے کر پکارا اور اندر آنے کے لئے کہا۔ رشید نے بلا چون وچرا تعمیل کی۔

کمرہ بلاشبہ اسی کا تھا مگر کتنا بدلا ہوا۔ صاف ستھرا۔ کرسیاں سلیقہ سے جمی ہوئی۔ وسط میں میز پر گلدان جس میں تازہ پھولوں کا گلدستہ رکھا تھا۔ قریب ہی چھوٹی سی میز پر عطردان۔ خاصدان اور سگرٹوں کا ڈبہ رکھا ہوا تھا۔

ایک آرام کرسی پر ایک لحیم شحیم دیو قامت انسان دراز تھا جس کے چہرے سے مسرت عیاں تھی

اس کے ہاتھ میں ایک ٹارچ تھی جس سے رشید پر روشنی ڈال رہا تھا۔

اندر آؤ۔ اندر آؤ اور مجھ سے اچھی طرح واقف ہو جاؤ اس نے کہا۔

رشید ڈرتے ڈرتے اندر داخل ہوا۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا۔ درشتی کے علامات چہرے سے غائب تھے گو روح کی آنکھوں میں ملاطفت تھی۔ پھر بھی وہ اس سے آنکھیں ملانے کی جرأت نہ کرسکتا۔

مجھے دیکھو میں موجودہ عید کی روح ہوں۔

رشید نے حکم کی تعمیل کی۔ روح ایک سبز رنگ کا جبہ پہنے ہوئے تھی۔ اس کے بند کھلے ہوئے تھے جس کی وجہ سے سینہ نظر آرہا تھا۔ اس کے نیچے برہنہ پیر بھی دکھائی دے رہے تھے۔ سر پر سبز پتوں اور پھولوں کا ایک تاج تھا۔ کمر کے گرد پٹکہ بندھا تھا جس کے نیچے زنگ خوردہ میان لٹک رہی تھی۔ مگر اس میں تلوار نہ تھی۔

تم نے مجھ جیسا کوئی نہ دیکھا ہوگا۔

ہاں کبھی نہیں۔

تم کبھی میرے خاندان کے بزرگوں سے نہیں ملے۔

مجھے یاد تو نہیں پڑتا غالباً کبھی اتفاق نہیں ہوا۔ کیا تمھارے بہت سے بھائی ہیں۔

تیرہ سو سے زیادہ۔

افوہ بہت بڑا خاندان ہے۔

عید حال کی روح کھڑی ہوگئی۔

اے روح تمھارا جہاں جی چاہے مجھے لے چلو۔ شب گزشتہ مجھے مجبوراً جانا پڑا تھا۔ لیکن میں نے جو سبق سیکھا ہے۔ اس نے اپنا عمل شروع کردیا ہے اگر آج تم مجھے کچھ سکھاؤگی تو اس سے مستفید ہونے کی کوشش کروں گا۔

اچھا میرا جبہ پکڑلو۔

رشید نے ایسا ہی کیا۔

نہ وہ کمرہ تھا نہ کمرے کی چیزیں۔ دونوں شہر کی ایک سڑک پر کھڑے تھے۔ بازار میں چہل پہل دیکھنے کے قابل تھی۔ لوگ اِدھر سے اُدھر آجا رہے تھے۔ صاف ستھرے عمدہ عمدہ کپڑے پہنے۔ عید کی مسرت میں سرشار۔ دنیا کی فکروں سے بے پروا بچوں کی خوشی کے تو کیا پوچھنے ہر چیز پر اترا رہے تھے۔ بزرگوں کو دکھا دکھا کر تعریف کروا رہے تھے۔ ہم سنوں کو بلا رہے تھے غرض ہر طرف مسرت و انبساط کا دور دورہ تھا۔ اور کیوں نہ ہوتا عید کی شام تھی۔ روح اپنی ٹارچ کی روشنی ہر شخص پر ڈال رہی تھی جس سے ان کی خوشی دوبالا ہوئی جارہی تھی۔

کیا تمھاری ٹارچ میں کوئی خاص اثر ہے۔

ہاں۔ وہ مسرتوں کی بارش کرتی ہے۔

کیا اس کا اثر ہر ایک پر یکساں ہے۔

ہاں۔ لیکن غریبوں پر زیادہ۔

کیوں غریبوں پر زیادہ کیوں ہے۔

اس لئے کہ ان کو خوشی کی زیادہ ضرورت ہے۔

اے روح مجھے حیرت ہوتی ہے کہ تمھاری وجہ سے یہ غریب اتنی مصیبت کیوں اٹھاتے ہیں۔

میری وجہ سے۔

تمھارے نام پر لوگ ان سے روپیہ حاصل کرتے ہیں۔ اور انھیں پریشانیوں میں مبتلا کرتے ہیں

میرے نام پر۔

برا نہ مانو۔ ممکن ہے میں غلطی کر رہا ہوں۔ بہرحال تمھارے یا تمھارے خاندان والوں کے نام سے یہ کیا جاتا ہے۔

دنیا میں ایسے لوگ بھی ہیں جو ہم کو جاننے کا دعوی کرتے ہیں اور اپنے اغراض۔ اپنی خواہشات

اور اپنے ارادوں کو ہمارے پردے میں پورا کرنا چاہتے ہیں حالانکہ وہ ہم سے بالکل واقف نہیں۔ میری بات یاد رکھو اور ایسے لوگوں سے ہوشیار رہو۔

پھرتے پھراتے وہ ایک ایسے محلہ میں پہنچے جہاں کی ظاہری حالت بتا رہی تھی کہ یہاں بالعموم غریب لوگ رہتے ہیں۔

رشید کے منشی منظفر کا مکان یہیں تھا۔ روح ان کے مکان پر مسرتوں کی بارش کرنے کے لیے اپنی ٹارچ ڈالنے لگی۔ انھوں نے منظفر کی بیوی کو دیکھا تو اس کے کپڑوں سے غربت کے آثار نمایاں تھے مگر سلیقہ اور صفائی موجود تھی۔ اس کے بچوں کو دیکھا سب کے سب صاف ستھرے کپڑے پہنے تھے چہروں سے مسرت ٹپک رہی تھی۔ بچے کمرے میں کودتے پھر رہے تھے اور بڑے بیٹھے ہنسی مذاق کر رہے تھے۔

تمھارے باپ کو اس کے سوا آتا کیا ہے۔ ظفر بھی ویسا ہی ہے۔ ہمیشہ دیر سے آنا ان کا معمول ہے۔

اماں میں آگیا ہوں ظفر نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

بھائی جان آگئے اماں۔ لڑکوں نے کہا۔

کہوں بھیا اتنی دیر سے کیوں آئے۔

رخصت نہیں ملی تھی اماں اس لئے سویرے نہ آسکا۔

دیکھنا ابا بھی آرہے ہیں۔ لڑکوں نے کہا بھائیجان آپ چھپ جائیے۔ جلدی کیجے۔

ظفر چھپ گیا۔ منظفر چھوٹے بچے کو گود میں لئے داخل ہوا "کیوں ظفر ابھی نہیں آیا" یہ اس کا پہلا سوال تھا۔

شاید وہ نہ آئے۔

نہ آئے۔ کیوں عید کے روز بھی نہ آئے گا۔ یہ کہتے کہتے اس کی ساری خوشی زائل ہو گئی۔

ظفر نے جب یہ دیکھا تو باہر نکل آیا۔ منظفر نے اسے گلے لگا لیا اور اس کی زائل شدہ مسرت عود کر آئی۔

تھوڑی دیر بعد سب کھانا کھانے بیٹھے۔ سب کے چہرے آنے والی عید کی خوشی سے چمک رہے تھے۔ رشید کو اس نظارے میں بیحد لطف آرہا تھا۔ یکایک اس نے پوچھا " اے روح کیا یہ چھوٹا بچہ زندہ رہے گا"۔

مجھے اس گھر میں ایک نشست خالی نظر آرہی ہے اگر یہ عکس برقرار رہا تو بچہ مرجائے گا۔

نہیں نہیں اے مہربان روح کہہ کہ وہ نہ مرے گا۔

اگر اس عکس میں کوئی تغیر نہ ہو تو میرے خاندان کا کوئی فرد اسے نہ پا سکیگا۔ اگر وہ مر رہا ہو تو مرجانے دو۔

رشید نے روح کی زبان سے اپنے ہی الفاظ سن کر سر جھکا دیا اور ایک ناقابل بیان رنج اس پر مستولی ہوگیا۔

اگر تم میں ذرا بھی انسانیت ہے تو تم غور کرو اور معلوم کرنے کی کوشش کرو کہ کن لوگوں کو زندہ رہنے کا حق ہے۔ ممکن ہے کہ اتنی دولت کے باوجود خدا کی نظروں میں تم زندہ رہنے کے مستحق نہ ہو۔ اور وہ غریب جن کو کھانے کو سوکھی روٹی بھی نہیں ملتی ہزار سال کی عمر پانے کے مستحق ہوں۔

رشید کانپنے لگا۔ اس کی نظریں جھک گئیں لیکن اپنا نام سنتے ہی اس نے اوپر دیکھا۔

ہمیں چاہیئے کہ ایسے موقع پر اپنے مالک رشید کو نہ بھولیں جن کی وجہ سے ہم عید کی خوشیوں سے بہرہ اندوز ہو رہے ہیں۔

ہاں، گو وہ ایک بے رحم، تنگ دل اور خسیس انسان ہے پھر بھی ہم اسے نہیں بھول سکتے۔ کاش وہ کل ہمارا مہمان بنتا۔

اب مسعود کو بھی کام سیکھنے کے لئے جانا نہ پڑے گا۔ کیونکہ بہت جلد اسے معقول مشاہرہ پر ایک اسامی مل جائے گی۔ جب یہ خبر مظفر نے سنائی تو خاندان کی مسرتوں میں اور اضافہ ہوگیا۔

یہاں سے نکل کر دونوں گلیوں میں پھرنے لگے۔ وہ جدھر جاتے خوشی ہی خوشی نظر آتی۔

امیر غریب۔ بچے بوڑھے سب عید کی خوشی میں سرشار تھے۔ اگر امیر اپنے امیرانہ لباس پر مغرور تھا تو غریب اپنے پھٹے پرانے مگر صاف ستھرے کپڑوں ہی میں پھولا نہ سماتا تھا۔ چلتے چلتے وہ ایک ایسے مقام پر پہنچے جہاں بہت سے جھونپڑے تھے۔ یہاں کان میں کام کرنے والے مزدور رہا کرتے تھے۔ یہ لوگ بھی عید کی خوشی منا رہے تھے۔ جھونپڑیوں میں چہل پہل نظر آرہی تھی جو اس بات کا ثبوت تھا کہ لوگ صبح کی تیاری میں مصروف ہیں۔

یکایک اس نے ایک قہقہہ سُنا جسے اس نے فوراً پہچان لیا کہ اس کے بھتیجے کا ہے۔ وہ چونکا اور خود کو ایک کمرے میں پایا۔ جہاں وہ اور روح دونوں کھڑے تھے۔ روح کے چہرے پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ اس کا بھتیجہ کہہ رہا تھا "خیال تو کرو کہ وہ عید کو بیہودگی سمجھتا ہے اور یہی اس کا اعتقاد ہے۔ ہاہاہاہا۔

کتنے شرم کی بات ہے کہ وہ ایسا سمجھتا ہے اس کی بیوی نے کہا...... اس کی بیوی بڑی خوبصورت عورت تھی۔ گورا رنگ۔ بڑی بڑی آنکھیں۔ پتلے ہونٹ۔ تنگ دہانہ۔ لانبے سیاہ بال ٹھڈی ایک خاص انداز سے جھکی ہوئی۔

حقیقت تو یہ ہے کہ بڑے میاں سٹھیا گئے ہیں گو یہ بات قابل افسوس ہے مگر کیا کیا جاسکتا ہے چونکہ وہ بزرگ ہیں اس لئے میں کوئی نصیحت نہیں کرسکتا۔ اور اگر نصیحت کی بھی جائے تو وہ سنتے کب ہیں۔

غالباً وہ بہت دولتمند ہیں۔ کم از کم تم تو یہی کہا کرتے تھے۔

ہیں تو۔ مگر ان کی دولت ان کے کسی کام کی نہیں ہے۔ وہ اسے کسی نیک کام میں نہیں لگاتے اپنے آرام کے لئے نہیں خرچ کرتے۔ انھیں یہ سوچ کر بھی اطمینان نہیں ہوتا کہ آئندہ وہ دولت ہمارے کام آئے گی۔

میں تو انھیں دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتی۔

میں گوارا کرتا ہوں۔ مجھے ان کی حالت پر افسوس ہوتا ہے۔ اگر میں کوشش بھی کروں تو مجھے ان پر غصہ نہیں آسکتا۔ انھیں اپنی حرکتوں کا نتیجہ خود ہی بھگتنا پڑتا ہے۔ کسی کو اس سے کیا۔

ہاں یہ تو ٹھیک ہے۔

مثلاً یہی دیکھو نا۔ انھوں نے ہمارے ہاں آنے سے انکار کر دیا۔ اس سے کس کا نقصان ہوا خود انہی کا۔ انھوں نے مسرت کے چند لمحات جو انھیں ہمارے پاس آنے سے حاصل ہو سکتے تھے ضایع کردیے لیکن میں ان سے نا امید نہیں ہوا ہوں۔ میں ہمیشہ ان سے درخواست کرتا رہوں گا۔ ممکن ہے ان کی حالت بدل جائے۔

اس کے بعد موضوع بدل گیا اور بجائے رشید کے تذکرہ کے عید کی مسرتوں کا ذکر ہونے لگا رشید کو اس گفتگو میں بے حد لطف آرہا تھا۔ حتیٰ کہ جب روح نے اس سے چلنے کو کہا تو اس نے اور تھوڑی دیر تک ٹھیرنے کی درخواست کی۔ مگر روح نے انکار کر دیا۔ نظارہ بدل گیا۔ رشید اور روح حسب معمول گشت لگا رہے تھے۔

وہ دور دور گئے۔ بہت کچھ دیکھا۔ بہت سے مکانوں میں پھرے۔ مریضوں کے سرہانے کھڑے ہوئے۔ مصیبت زدہ لوگوں کے پاس پہنچے۔ دواخانہ۔ جیلخانہ ہر جگہ جہاں تکلیف کی گزر ہے گئے۔ مگر انھیں ہر جگہ خوشی کا دور دورہ نظر آیا۔ لوگ اپنا رنج و غم، بیماری۔ قید سب کچھ بھولے ہوئے تھے۔ ان کے سامنے صرف عید اور اس کی خوشیاں تھیں۔

رات بہت طویل تھی۔ یا ممکن ہے یہ صرف رشید کا خیال ہو۔ بہرحال اسے خود اس بارے میں شبہ تھا۔ اسے حیرت اس بات پر ہو رہی تھی کہ اس میں کوئی تغیر رونما نہ ہوا تھا۔ برخلاف اس کے روح بوڑھی ہوتی چلی جا رہی تھی۔ رشید بہت دیر تک اس پر غور کرتا رہا۔ مگر جب اس کی سمجھ میں نہ آیا تو اس نے خود روح سے پوچھا۔

کیا روحوں کی زندگی مختصر ہوتی ہے۔

میری زندگی بہت مختصر ہے وہ شام تک ختم ہو جائے گی۔

شام تک

ہاں شام تک۔ میری زندگی صرف اس قدر ہے۔ اچھا اب ہمیں جلدی کرنی چاہئے۔

روح نے دو بچے رشید کو دکھائے اور کہا کہ ان میں سے ایک معصومیت ہے اور دوسری بیچارگی اور ان کا خیال رکھنے کی تاکید کی دونوں بچے انتہائی تکلیف زدہ معلوم ہو رہے تھے۔ ان کو دیکھکر رشید کے دل میں رحم کا جذبہ پیدا ہوا۔ اس نے پوچھا "کیا ان کے لئے کوئی جائے پناہ نہیں ہے؟ تمھیں کیا فکر ہے۔ تمھاری مصروفیات خود اسقدر زیادہ ہیں کہ تم ان چیزوں کی طرف توجہ نہیں کر سکتے۔

رشید کسی سوچ میں پڑ گیا ــــ جب وہ اپنے خیالوں سے چونکا تو روح کا کہیں پتہ نہ تھا البتہ ایک دوسری روح آہستہ آہستہ اس کی طرف آ رہی تھی۔

(۴)

تیسری روح سے ملاقات

روح آہستگی۔ متانت اور سنجیدگی سے اس کی طرف بڑھی جب وہ نزدیک آ گئی تو رشید اپنے گھٹنوں کے بل گر پڑا کیونکہ روح مجسم معمہ معلوم ہو رہا تھی۔ وہ سیاہ لباس پہنے ہوئے تھی جس سے اس کا سر، منھ اور سارا جسم چھپا ہوا تھا۔ لباس اسقدر سیاہ تھا کہ رات کی تاریکی میں اسے پہچاننا مشکل تھا جب وہ اس کے بازو آئی تو اس نے محسوس کیا کہ اس کا قد لانبا ہے۔ اس کی موجودگی نے رشید کو خوف زدہ کر دیا۔ روح کے متعلق وہ کچھ نہ جان سکا کیونکہ اس نے زبان سے ایک لفظ نہ کہا۔

غالباً مجھے عید مستقبل سے ملاقات کا شرف حاصل ہے۔

روح نے کوئی جواب دئے بغیر ہاتھ سے صرف آگے کی طرف اشارہ کیا۔

غالباً تم مجھے وہ چیزیں دکھانا چاہتی ہو جو آئندہ پیش آنے والی ہیں۔ کیوں ہے نا۔

روح کے سر کو خفیف سی حرکت ہوئی اور بس۔

گو اس عرصہ میں رشید روحوں کی صحبت کا کافی عادی ہو چکا تھا۔ پھر بھی وہ اس کی خاموشی سے ایسا خوف زدہ ہو گیا کہ اس کے پیر کانپنے لگے۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ کھڑا بھی نہیں رہ سکتا۔ روح نے ایک لمحہ توقف کیا۔ گویا اسے اپنی حالت پر قابو پانے کا موقعہ دے رہی ہے لیکن رشید کی حالت بدتر ہوتی گئی اس نے بہ مشکل یہ الفاظ کہے۔ اے مستقبل کی روح میں تجھ سے دوسری تمام روحوں سے زیادہ خائف ہوں لیکن چونکہ مجھے معلوم ہے اور امید ہے کہ تیری ملاقات میں میری بھلائی مضمر ہے۔ اس لئے میں تمھارے ساتھ رہنے پر تیار ہوں۔ کیا تم مجھ سے باتیں نہ کرو گی۔

روح نے پھر بھی کوئی جواب نہ دیا۔ اور برابر آگے کی طرف اشارہ کرتی رہی۔

اچھا چلو۔ رات ختم ہو رہی ہے اور وقت بہت قیمتی ہے۔

روح آہستہ آہستہ آگے کو بڑھی اور رشید اس کے پیچھے چلا...... وہ شہر میں داخل ہو گئے۔ لوگ اِدھر اُدھر پھر رہے تھے چلتے چلتے دونو ایک جگہ پہنچے جہاں چند تاجر باتیں کر رہے۔ روح ٹھیر گئی رشید یہ دیکھ کر کہ وہ ان کی طرف اشارہ کر رہی ہے ان کی باتیں سننے لگا۔

مجھے سوائے اس کے اور کچھ نہیں معلوم کہ اس کا انتقال ہو گیا ہے۔

کب انتقال ہوا۔

کل شب کو۔

کیسے! میرا تو خیال تھا کہ وہ کبھی نہ مرے گا۔

اللہ جانے کیسے مرا۔

اس کی دولت کیا ہوئی۔

مجھے نہیں معلوم۔ کسی کے نام چھوڑ گیا ہوگا۔

غالباً جنازہ میں بہت کم لوگ شریک ہوں گے۔ اس کے تھا ہی کون۔

رشید نے روح کی طرف اس خیال سے دیکھا کہ شاید وہ اس کا مطلب سمجھاوے۔ مگر روح نے

آگے بڑھ کر اور دو آدمیوں کی طرف اشارہ کیا۔

ایک کہہ رہا تھا۔ آخر بڈھا لڑھک ہی گیا۔

عین عید کے موقع پر..... اچھا خدا حافظ۔

رشید نے یہ سُن کر روح سے کہا۔ شاید یہ میرے متعلق تھا۔ افسوس کسی کو میرے ساتھ ہمدردی نہیں خداوندا رحم کر۔

یکایک نظارہ بدل گیا۔ اس نے خود کو ایک پلنگ کے پاس کھڑا ہوا پایا۔ جس پر کوئی چیز ایک پھٹی ہوئی چادر میں لپٹی پڑی تھی، کمرہ اس قدر تاریک تھا کہ صاف دکھائی نہ دیتا تھا۔ پھر کمرہ میں ایک قسم کی روشنی ہوئی جس میں رشید نے دیکھا کہ پلنگ پر ایک آدمی ہے جس پر نہ کوئی رونے والا ہے نہ کوئی محبت کرنے والا۔ رشید نے روح کی طرف دیکھا اس کا ہاتھ سر کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ چادر کو ذرا سی جنبش دے کر وہ معلوم کر سکتا تھا کہ یہ شخص کون ہے۔ اسے دیکھنے کی خواہش بھی ہوئی، لیکن جس طرح اس میں روح سے پیچھا چھڑانے کی ہمت نہ تھی۔ اس طرح منھ سے کپڑا ہٹانے کی ہمت بھی نہ ہوئی۔

اے روح یہ ایک خوفناک جگہ ہے۔ یہاں سے چلو۔ میں یقین دلاتا ہوں کہ اگر یہاں سے چلا بھی جاؤں تو جو سبق میں نے سیکھا ہے اسے نہ بھولوں گا۔

روح نے کوئی جواب نہ دیا۔ صرف سر کی طرف اشارہ کرتی رہی۔

میں سمجھ گیا۔ اور اگر مجھ میں ہمت ہوتی تو میں ایسا کرتا۔ مگر مجھ میں ہمت نہیں ہے۔ اے روح واقعی مجھ میں ہمت نہیں ہے۔

لیکن روح اسے ہی دیکھے جا رہی تھی۔

اے روح میں تجھ سے التجا کرتا ہوں کہ اگر کوئی شخص اس شہر میں اس کی موت سے متاثر ہونیوالا ہے تو اسے مجھے بتا دے۔

روح نے اپنا سیاہ جبہ پھیلا دیا اور جب اسے سمیٹا تو رشید کو دن کی روشنی میں ایک کمرہ دکھائی دیا

جہاں ایک عورت اور اس کے بچے تھے اسے کسی کا انتظار تھا۔ وہ بیقراری کے عالم میں کمرے میں ٹہل رہی تھی۔ ہر آواز پر چونک پڑتی۔ کھڑکی کے باہر جھانکتی۔ گھڑی دیکھتی۔ کام کرنے کی فضول کوشش کرتی اسکی پریشانی ہر لمحہ بڑھتی ہی جارہی تھی......... آخر کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ دروازہ کھولنے پر اس کا شوہر اندر داخل ہوا۔ آنے والا متوسط عمر کا تھا۔ اس کے چہرے سے تفکرات عیاں تھے۔ لیکن اس وقت ایک خاص قسم کی کیفیت موجود تھی۔ ایک قسم کی مسرت جسے وہ خود شرمندہ ہوکر چھپانے کی کوشش کر رہا تھا۔

کیا خبر ہے —— اچھی ہے یا بری

بری۔

ہم تباہ ہو گئے

نہیں ابھی امید باقی ہے۔

اگر وہ بچ جائے۔ ہاں امید تو ہر وقت ہی رہتی ہے۔

بچ جائے !......... وہ تو مر چکا۔

عورت کے چہرے سے نرم دلی اور صبر کا مادہ نمایاں تھا۔ اس کے باوجود اسے یہ سن کر خوشی ہوئی مگر دوسرے ہی لمحہ میں اس نے اس کے لئے دعاء مغفرت کی۔ اس مدہوش شخص نے جو کچھ کہا تھا صحیح نکلا وہ اس وقت نہ صرف بہت بیمار تھا بلکہ مر رہا تھا۔

ہمارا قرضہ کدھر منتقل کیا جائے گا۔

معلوم نہیں۔ لیکن اس وقت سے پہلے ہمیں روپیہ مل جائے گا۔ ہمیں امید۔ ہے کہ اس کا جانشین اسی کے جیسا بے رحم نہ ہوگا۔

خدا کرے کہ ایسا ہو، بہرحال فی الحال تو اطمینان ہو گیا۔

میں اس کی موت سے متعلق کچھ اچھے جذبات دیکھنا چاہتا ہوں۔ ورنہ وہ تاریک کمرہ جسے

ہم نے ابھی چھوڑا ہے ہمیشہ میری نظروں میں رہے گا۔

روح اسے گلیوں میں سے پھراتی ہوئی مظفر کے گھر لے گئی۔ سب لوگ وہاں موجود تھے۔ مگر خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ بچے بھی خاموش بیٹھے تھے۔

ابا اب تک نہیں آئے حالانکہ وہ ہمیشہ اس وقت تک آجایا کرتے تھے...... لیکن آج کل وہ چلتے بھی تو آہستہ ہیں۔

وہ چھوٹے بچے کو گود میں لے کر کتنا تیز چلا کرتے تھے۔

جی ہاں میں نے بھی اکثر دیکھا ہے۔

وہ ہلکا پھول جیسا تو تھا۔ اور تمھارے ابا اسے اس قدر چاہتے تھے کہ انھیں اسے گود میں لینے خوشی ہوتی تھی ——— دیکھنا شاید وہ آگئے۔

مظفر گھر میں غمگین و متفکر داخل ہوا۔ مگر لڑکوں کو دیکھ کر اپنا رنج وغم بھول گیا اور ان سے ہنس ہنس کر باتیں کرنے لگا۔ یکایک اسے چھوٹے بچے کا خیال آگیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور وہ کمرے سے نکل کر باہر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد اپنی حالت پر قابو پا کر پھر اندر آیا، اس نے کہا کہ رشید کا بھتیجا اس پر بے حد مہربان تھا۔ وہ اسے راستہ میں ملا اور غمگین دیکھ کر وجہ دریافت کی اسنے بھی چچا کے انتقال پر اس کے ساتھ اظہار ہمدردی کی۔

کیا وہ اپنے چچا سے بالکل مختلف ہے۔

ہاں بالکل...... اس نے مسعود کو ایک جگہ دلانے کا وعدہ کیا ہے..... مگر چاہے ہم کہیں اور کسی حال میں بھی کیوں نہ ہوں۔ اپنے چھوٹے بچے کو نہیں بھول سکتے۔ آہ کتنا پیارا بچہ تھا۔

بچہ کے تذکرہ سے سب کی آنکھیں اشکبار ہوگئیں۔ مگر مظفر نے سب کو سمجھایا اور تسلی دی۔

اے روح کوئی چیز مجھ سے کہہ رہی ہے کہ ہماری جدائی کا وقت قریب آگیا ہے۔ اس لئے جانے سے پہلے یہ بتادو کہ وہ مرا ہوا شخص کون تھا۔

مستقبل کی روح اسے لے چلی۔ وہ چلتی رہی چلتی رہی بغیر کہیں رکے یا زبان سے ایک لفظ نکالے حتیٰ کہ وہ شہر سے باہر ایک قبرستان میں پہنچ گئی۔ یہاں ٹھیر کر روح نے ہاتھ سے ایک طرف اشارہ کیا۔

دونوں قبروں کو پھاندتے گرتے پڑتے قبرستان کی دوسری طرف پہنچ گئے۔ روح رک گئی۔ اور ایک قبر کی طرف اشارہ کیا وہ کانپتے ہوئے اس کی طرف بڑھا۔۔۔ اسے روح میں کوئی خوفناک چیز نظر آ رہی تھی۔

قبل اس کے کہ میں تمہاری بتائی ہوئی قبر کی طرف جاؤں۔ مجھے صرف ایک بات بتا دو کہ آیا یہ اُن چیزوں کا عکس ہے جن کا ہونا یقینی ہے یا جن کے ہونے کا امکان ہے ـــــ مگر روح برابر قبر کی طرف اشارہ کرتی رہی۔

انسان کا راستہ چند خاص نتائج کی طرف لیجاتا ہے اور اگر اس راستے سے ہٹ جائیں تو نتائج بھی بدل جاتے ہیں۔ بولو یہی بات ہے نا۔

روح بت کی طرح خاموش تھی۔

مجبوراً وہ قبر کے پاس گیا۔ اس پر ایک کتبہ لگا ہوا تھا جس پر خود اس کا نام لکھا تھا..... اچھا تو میں ہی وہ شخص ہوں جو پلنگ پر پڑا تھا۔

روح نے پہلے قبر کی طرف پھر رشید کی طرف اشارہ کیا۔

نہیں نہیں۔ اے روح نہیں۔

مگر روح پر کوئی اثر نہ تھا۔

اے روح اس نے اس کے جبہ کو پکڑتے ہوئے کہا۔ میری بات سنو۔ اب میں وہ نہیں ہوں جو پہلے تھا۔ میں اپنے عادات بدل دوں گا۔ مجھے صرف اتنا بتا دو کہ کیا اب بھی فلاح کی کوئی امید ہے۔

روح کا ہاتھ ہلتا ہوا معلوم ہوا۔ مگر اس نے زبان سے کچھ نہ کہا۔

اچھی روح تم مجھ سے ہمدردی کا اظہار کر رہی ہو۔ مجھے صرف اتنا یقین دلا دو کہ میں اپنی طرز زندگی

بدل کران عکوس کو جو تم نے مجھے دکھائے ہیں بدل سکتا ہوں۔

ہاتھ اب بھی ہل رہا تھا۔

میں عید کی عزت کروں گا۔ اور سال بھر تک عید مناتا رہوں گا۔ میں ماضی، حال اور مستقبل سے سبق حاصل کروں گا۔ اتنا کہہ دو کہ میں اس کس مپرسی کے عالم میں نہ مروں گا۔

اس تکلیف میں رشید نے روح کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اس نے چھڑانے کی کوشش کی مگر گرفت اس قدر مضبوط تھی کہ وہ ناکام رہی مگر وہ روح کی طاقت کا زیادہ دیر مقابلہ نہ کر سکا۔ اس نے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔ رشید نے اپنے ہاتھ دعا کے لئے اٹھائے۔ روح کی حالت میں تغیر رونما ہوا۔ وہ سمٹی ہٹی اور غائب ہوگئی۔ رشید کے سامنے مچھروان کے ڈنڈے کے سوا کچھ نہ تھا۔

(۵)

انجام

وہ اپنے کمرہ میں تھا اور اسے ایک موقعہ ملا تھا کہ وہ اپنا طرز زندگی بدل کر اس خوفناک انجام سے جو اسے دکھایا گیا تھا خود کو بچالے۔ میں اپنے ماضی حال اور مستقبل سے سبق لے کر مستقبل کو اچھا بنانے کی کوشش کروں گا۔ اے حامد میں اس کے لئے تیرا اور عید دونوں کا ممنون ہوں۔ یہ کہتے کہتے اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ میں اس وقت کتنا خوش ہوں۔ بالکل ایک بچے کی طرح۔ ایک فرشتے کی طرح۔ ہر شخص کو عید مبارک ہو۔ یہ کہکر وہ بستر سے اٹھ کھڑا ہوا۔ یہی وہ دروازہ ہے جس سے حامد داخل ہوا۔ یہ وہ کونا ہے جہاں عید حال کی روح بیٹھی۔ یہ وہ کھڑکی ہے جہاں میں نے روحوں کو دیکھا۔ سب کچھ صحیح ہے سب کچھ واقعہ ہے۔ ہا ہا ہا ہا..... معلوم نہیں آج کونسا دن ہے۔ نہ جانے میں کب تک روحوں کے ساتھ رہا۔ مجھے کچھ بھی نہیں معلوم۔ میں ایک بچہ کی طرح ہوں، بالکل بچہ کی طرح۔ خیر کیا پرواہ ہے۔ میں بچہ ہی اچھا...... وہ دوڑ کر کھڑکی کے پاس گیا۔ کھڑکی کھول کر باہر جھانکنے لگا۔ نیچے ایک لڑکا جا رہا تھا۔ رشید نے اس سے پوچھا۔ میاں صاحبزادے آج کیا ہے۔

آج کیا ہے۔ واہ تم کو یہ بھی نہیں معلوم۔ عید ہے عید۔

عید۔ خدا کا شکر ہے کہ میں عید کی خوشی سے محروم نہیں ہوا۔ روحوں نے سب کچھ ایک ہی رات میں
کردیا۔ وہ سب کچھ کر سکتی ہیں۔

عید مبارک میاں صاحبزادے۔

عید مبارک جناب عید مبارک۔

اس نے جلدی جلدی اپنے بہترین کپڑے نکالے۔ داڑھی بنائی اور نہا دھوکر عید گاہ کی طرف
چلا۔ آج اس کا دل مسرتوں سے معمور تھا۔

سڑکوں پر چہل پہل تھی۔ لوگ تیز تیز قدم اٹھائے عید گاہ کی طرف چلے جا رہے تھے۔ رشید بھی انکے
ساتھ ہولیا تھوڑی دور جانے کے بعد اس نے اس مرد شریف کو دیکھا جو کل اس کے پاس چندہ وصول کرنے
آیا تھا۔ وہ لپک کر اس سے جا ملا۔ اس نے بھی اسے پہچان لیا۔

کیوں مسٹر رشید خیریت۔

رشید مارے شرم کے پسینہ پسینہ ہوگیا۔ مگر وہ جانتا تھا کہ اسے کیا کرنا چاہئے..... اور آپ کا مزاج
مجھے امید ہے کہ کل آپ کو کامیابی ہوئی ہوگی...... عید مبارک۔ عید مبارک
مسٹر رشید۔

آو۔ تعجب کی کوئی بات نہیں ہے۔ میں معافی چاہتا ہوں۔ کل تو میں آپ سے مذاق کر رہا تھا
.... اس نے اس کے کان میں کچھ کہا۔

واللہ...... مسٹر رشید آپ مذاق تو نہیں کر رہے ہیں۔

نہیں نہیں واقعی۔ اس سے ایک پائی کم نہیں۔ اس میں گزشتہ سالوں کی رقم بھی شامل ہے۔ کیا آپ مہربانی کرکے...
میری سمجھ میں نہیں آیا کہ میں آپ جیسے فیاض اور.....

بس بس اب ایک لفظ کہنے کی ضرورت نہیں۔ کیا آپ کسی وقت غریب خانہ تک تکلیف فرمائینگے۔

انشاء اللہ ضرور۔

شکریہ بہت بہت شکریہ بڑی عنایت ہے۔

وہ عید گاہ گیا۔ بڑے خضوع و خشوع سے نماز پڑھی اس کے بعد بہت دیر تک گلیوں میں پھر کر لوگوں کے آنے جانے کا تماشہ دیکھتا رہا۔ بہت سے لوگوں سے خود بھی ملا۔ عید کی مبارک باد دی۔ خیرات تقسیم کی۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ آج کی جیسی خوشی اسے کبھی نہ ہوئی تھی...... یکایک اسے خیال آیا کہ سلیم نے اسے دعوت دی تھی بارہ بج چکے تھے۔ اسواسطے وہ تیز تیز قدم اٹھاتا اس کے گھر کی طرف چلا۔ دروازہ پر پہنچ کر وہ ٹھٹک گیا۔ اسے اندر جانے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔ لیکن آخر ہمت کر کے وہ گھر میں داخل ہو گیا۔ دروازہ پر اسے ایک ملازم ملا۔ اس سے دریافت کیا۔ "کیا تمھارے سرکار گھر پر ہیں"

جی ہاں ہیں

کہاں۔ باہر یا اندر۔

جی اندر ہیں۔

خیر میں چلا جاؤں گا شاید تم نہیں جانتے کہ میں ان کا عزیز ہوں۔

وہ بے تحاشا گھر کے اندر داخل ہوا سلیم اور اس کی بیوی دونو بیٹھے ہوئے تھے۔ سلیم کی بیوی ایک غیر مرد کو یوں آتے دیکھ کر چیختی ہوئی دوسرے کمرہ میں چلی گئی۔ سلیم نے اپنی بیوی کی پریشانی کا سبب دریافت کرنے کو دروازہ کی طرف دیکھا تو وہاں اس کا چچا کھڑا تھا۔

عید مبارک سلیم۔ میں تمھاری دعوت قبول کر کے دوپہر کا کھانا کھانے آیا ہوں۔ عید مبارک

اوہ چچا جان عید مبارک ...... یہ کہہ کر دونو گلے ملے۔

سلیم اپنی بیوی کو بلا لیا۔ وہ بھی ملی۔ تھوڑی دیر بعد سلیم کی بڑی سالی بھی آگئی۔ کھانا نکالا گیا اور سب کھانے بیٹھے اس وقت ہر شخص انتہائی مسرور تھا۔ رشید شام تک وہیں رہا۔ پھر اپنے گھر آگیا۔

دوسرے روز وہ ساڑھے سات بجے ہی اپنی دوکان پہنچ گیا۔ تاکہ مظفر سے پہلے پہنچے۔ "آٹھ بج" سوا آٹھ ہو گئے۔ مگر اس کا پتہ نہ تھا۔ آٹھ بجکر بیس منٹ ہوئے تھے کہ وہ آیا۔

کیوں جناب اتنی دیر سے آنے کا کیا مطلب ہے۔ اس نے مظفر کے آتے ہی پوچھا۔

مجھے افسوس ہے۔ راستہ میں کچھ لوگ مل گئے تھے۔ اس لئے دیر ہو گئی۔

اچھا آپ کو افسوس ہے ذرا یہاں تو تشریف لائیے۔

مظفر بیچارے کی تو جان ہی نکل گئی۔ اس نے مری ہوئی آواز میں کہا، ایسا سال میں ایک آدھ دفعہ ہی ہوتا ہے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آئندہ کبھی ایسا نہ ہوگا۔

ہاں ہاں میں سمجھ گیا۔ آپ کو معلوم ہے کہ میں ان چیزوں کا روادار نہیں ہوں۔ اسلئے اسلئے اس نے مظفر کو دھکا دیتے ہوئے کہا میں تمھاری تنخواہ چالیس روپئے کر دینے والا ہوں۔

مظفر کا منھ مارے حیرت کے کھل گیا اور اس کی زبان سے ایک لفظ نہ نکلا۔

عید مبارک مظفر عید مبارک۔ میرے دوست میں واقعی تمھاری تنخواہ بڑھانے والا ہوں تاکہ تم اپنے مصیبت زدہ کنبے کو زیادہ آرام سے رکھ سکو ——— اور ہاں آج دوپہر میں ہم تمھارے دوسرے معاملات سے متعلق گفتگو کریں گے۔

رشید نے جو کچھ کہا تھا۔ وہ کر دکھایا۔ بلکہ اس سے کچھ زیادہ ہی مظفر کے چھوٹے لڑکے سے مثل باپ کے محبت کرتا تھا۔ وہ بہترین دوست۔ بہترین آقا اور بہترین آدمی سمجھا جانے لگا۔ بعض لوگ اس کے اس تغیر پر ہنستے مگر وہ اس کی پرواہ نہ کرتا تھا۔ کیونکہ وہ ان سے زیادہ عقلمند تھا۔ اب وہ ہمیشہ مسرور رہا کرتا تھا۔

روحوں سے اس کی ملاقات پھر نہیں ہوئی۔ مگر ماضی، حال اور مستقبل سے سبق لے کر اس نے اپنی زندگی سنوار لی لوگ اس کے بارے میں کہا کرتے تھے کہ وہ عید منانا خوب جانتا ہے۔

'ماخوذ'

سمندر سے خطاب!

از

سکندر علی وجد متعلم سال پنجم

اے محیطِ بیکراں اے صدرِ بزمِ کائنات
پیکرِ عالم میں دوڑاتا ہے تو خونِ حیات

سربلندی دیدنی ہے تیری اے سرمستِ ناز
آسماں گھستا ہے چوکھٹ پر تری فرقِ نیاز

تیری ہر چینِ جبیں میں رہتی ہے طوفاں دربغل
شور ہے تیرا بدامن بانگِ صد طبل و دہل

تو اڑاتا ہے پرخچے کشتیٔ فولاد کے
دانت کر دیتا ہے کھٹے قوتِ ایجاد کے

سارے عالم پہ ہے تیری سرفرازی آشکار
بادلوں کا رب ہے تو اور بجلیوں کا کردگار

ہے پیامِ موت گویا موج کی ادنیٰ خراش
تیری اک جنبش کرے دامانِ ساحل پاش پاش

وجدؔ کو معلوم ہے تو کس لئے بیتاب ہے
قلب تیرا نشترِ الفت سے لذت یاب ہے

آہ و زاری سے تری واقف نہیں اہلِ جہاں
مینہ کی بوندیں ہیں تیرے آنسو ابر آہوں کا دھواں

بلبلے چھالے ہیں تیرے جسم پر تسخیر کے
حلقۂ گرداب، حلقے ہیں تری زنجیر کے

تیری آہوں کے شرارے برقِ مضطر بن گئے
اشک جو آنکھوں سے ٹپکے جم کے گوہر بن گئے

عاشقِ ناداں دھرا کیا دامنِ ساحل میں ہے!
جس نے تڑپایا تجھے پنہاں مہِ کامل میں ہے!

؟!

کیا، کب، کہاں، کیوں اور کیسے !..............

یہ ساری کائنات کیا ہے ؟ یہ آتش فشاں پہاڑیاں، پُرعظمت برفانی چوٹیاں، نرم رو ندیاں متلاطم سمندر، اور ہزاروں قسم کی مخلوق کتنی عجیب ہے !

سب سے زیادہ عجیب تو وہ مخلوق ہے جس نے کائنات پر اتنا تصرف حاصل کرلیا ہے کہ اس کے کارنامے دیگر مخلوقات عالم کو رازہائے سربستہ کی طرح نظر آتے ہیں، یہ بڑی بڑی سی مہیب چیز کیا ہے، جو پانی کی سیال سطح پر، نہایت زور و شور سے بہہ رہی ہے ؟ پانی میں چھوٹا سا پتھر ڈوب جاتا ہے، لیکن یہ اتنی بھاری بھرکم پہاڑ کی سی چیز ہمیشہ ابھری ابھری رہتی ہے،.......... کیوں ! زمین پر یہ اژدہے کی طرح چنگھاڑنے والی چیز کیا ہے ؟ جس میں ہزاروں انسان، حیوان، جمادات اور نباتات بھرے ہوے جاتے ہیں اور جاتے ہی رہتے ہیں۔

کائنات میں اتنی رنگا رنگی اور بوقلمونی کیوں ہے ؟ یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں ! دنیا میں اتنی ناانصافی کیوں روا رکھی گئی ہے، ہر شخص ان کی طرح پری چہرہ کیوں نہیں ہوجاتا ؟ حسن اتنا بے نیاز اور مستغنی کیوں ہے،

اور عشق اس قدر منکسر اور مجبور کیوں بنایا گیا ہے۔؟

زندگی کے مظاہر ایک دوسرے سے اتنے مختلف کیوں ہیں؟ میں نے ایک کمزور اور نحیف عورت کو دیکھا جس کی گود میں ایک بلکتا ہوا بچہ تھا، اس کے کپڑے میلے اور بوسیدہ تھے، شکستہ حالی کے آثار اس کی ہر حرکت سے نمایاں تھے، وہ ہر رہرو سے، اس کی عزت کا، شرافت کا اور آخر میں خدا کا واسطہ دے کر خیرات مانگ رہی تھی، اس کی ضعیف آواز بازار کے شور میں مدغم ہو کر فضا میں گم ہو جا رہی تھی۔ موٹریں بڑے کروفر کے ساتھ سامنے سے گزر رہی تھیں، اور ان میں اس کے ہم جنس بیٹھے ہوئے اس کی صعوبتوں سے بے نیاز محو تماشا تھے، ہر آنے والے کے چہرے کو امید بھری نظروں سے تکتی ہوئی وہ اس کے آگے ہاتھ پھیلا دیتی تھی، لیکن وہ اس پر حقارت آمیز نظریں ڈالتا ہوا، اپنے جسم کو سکیڑ کر تاکہ اس کی گندگی سے ملوث نہ ہو جائے، گزر جا رہا تھا۔ آخر میں وہ ایک دوکان میں ڈرتے ڈرتے داخل ہوئی اور بڑی لجاجت سے کہا، .... سیٹھ جی خدا کے نام پر کچھ دلا دیجئے، صبح سے بھوکی ہوں، .... دوکاندار نے جھڑک کر کہا ...... چلے جاؤ بڑھیا یہاں گڑبڑ کیوں مچاتی ہو" .... "نوکری تو بھی دلا دیجئے سیٹھ! .... خدا آپ کو اس کا اجر دے گا، میرا بچہ چھوٹا ہے، دعائیں دونگی، میری مصیبت آپ دور کیجیے" خدا آپ کی ...." ابھی اس کی بات ختم نہ ہونے پائی تھی کہ سیٹھ کی گرجدار آواز سنائی دی .... نکل جاؤ یہاں سے، اٹھائی گیروں کے لئے یہ جگہ نہیں ہے" عورت کا کمزور دل ہے اس سے دہل گیا اور مایوس ہو کر بھاری قدموں کے ساتھ دوکان سے باہر آئی۔ اس نے بچے کو جو اس وقت زور و شور سے رو رہا تھا سینے سے چمٹا لیا، کیوں کہ خدا کی وسیع زمین پر اس کی ساری متاع صرف اسی کی ہستی سے قائم تھی تمام کائنات اسے اس وقت بیگانہ نظر آ رہی تھی، میں نے یہ منظر دیکھ کر کہا کہ زندگی یقیناً ایک حوصلہ شکن مصیبت ہے، لیکن اگر زندگی مصیبت ہے تو سب کے لئے یکساں مصیبت کیوں نہیں ہو جاتی؟

میں نے دیکھا ہے کہ جہاں یاس و حرمان کی ایسی زندہ تصویریں صفحہ ہستی پر نظر آتی ہیں، ایسی بھی ہستیاں ہیں جن کی زندگی عبارت ہوتی ہے بانسری کی ایک دلکش آواز سے، اور جن کا مقصود حیات

عیش کاری کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا' ایک ہی محلے کے دو مکانوں سے عیش و عشرت کے نغمے اور درد و غم کی دبی ہوئی سسکیاں، میں نے بیک وقت نکلتی ہوئی سنی ہیں، کیا دنیا میں کبھی اس کا تصور ہو سکتا ہے کہ ایک انسان تڑپ تڑپ کر ایک قصر کے آگے اپنی جان دے ڈالے'.......... اور رات بھر کے عیش و عشرت کے بعد کوئی "محض تماشے کے لئے "صبحدم بالائے بام" آئے! لیکن یہ تخیل صرف دنیائے شعر ہی کا آفریدہ نہیں ہے، بلکہ انسانی جماعتوں میں ایسے خونخوار بھیڑیے بھی موجود ہیں جو اپنے اغراض و مفاد کی خاطر انسانی جانوں کی قربانی کرنے سے نہیں چوکتے' دولت اور افلاس دنیا میں ہمیشہ برسر پیکار رہے ہیں اور اس جنگ میں غریبی اور افلاس کی مجبوریاں ہمیشہ انسانیت کے لئے باعث سوگواری رہی ہیں.......

کائنات اور معاشرت کا یہ نظام کب سے قائم ہے' کیوں قائم ہے اور کب تک قائم رہے گا۔

کون سمجھائے اور کیسے سمجھائے!

کیا سچی مسرت سنگین عالیشان محلوں میں، مخمل کے پرتکلف پردوں کے اندر اور مزین روشن کمروں میں حاصل ہوتی ہے، یا غریب دیہاتی کا بوسیدہ مکان' اس کی ٹوٹی ہوئی چارپائی اور اس کے لہلہاتے ہوئے کھیت سامان انبساط پیدا کرنے کا باعث ہوتے ہیں؟

میں نے یہ بھی دیکھا ہے کہ دنیوی تعیشات پر پورا قابو حاصل ہو جانے کے بعد بھی، ہر انسان کے دل میں ایک چبھتا ہوا کانٹا ہوتا ہے جو اسے بے چین و بیقرار رکھتا ہے، انسانی خواہشات کا سلسلہ لامتناہی ہے جس قدر انسان کی خواہشات پوری ہوتی جاتی ہیں' اسی قدر شدت کے ساتھ وہ نئی خواہشوں کی تکمیل میں مصروف ہو جاتا ہے' اس کی زندگی دراصل خواہشات کی تکمیل کی بے نتیجہ جد و جہد کا ایک دوسرا نام ہوتی ہے، بظاہر اس قسم کے لوگوں کی زندگی قابل رشک معلوم ہوتی ہے' اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ لوگ ایک سیلاب مسرت میں غرق ہیں' لیکن حقیقت میں یہ لوگ آداب و اخلاق کی خود ساختہ بندشوں میں اپنے آپ کو جکڑ لیتے ہیں اور اس طرح سے ان کے دل و دماغ کی اور ان کی روح کی ساری آزادیاں سلب ہو جاتی ہیں' وہ اپنی زندگی کی خفیف سے خفیف حرکت کے لئے بھی چند طویل اور بے معنی قوانین اور آداب کے

پابند ہوتے ہیں، جن کی خلاف ورزی ان سے ناممکن نہیں ہو سکتی کسی شخص کے خلاف ان کے دل میں کتنا ہی زہر بھرا ہوا کیوں نہ ہو وہ اُس سے اخلاق کے ساتھ، مسکراتے ہوئے ایک تکلف و تصنع سے ملیں گے، جس معصوم اور فطری طریقہ سے ایک دہقان اپنے جذبات کا اظہار کر سکتا ہے، یہ لوگ اس سے محروم ہیں۔ کتنے لوگ ایسے ہیں جو کسان کی شام کے وقت کی دلکش آلاپ سن کر ایک ٹھنڈی آہ نہ بھرتے ہوں، اور اپنی بےچین زندگی کا اس کی پر امن زندگی سے مقابلہ نہ کرتے ہوں، کسان کو وہ ناقابل بیان مسرت حاصل ہے، جس سے شہری اپنے نام نہاد تہذیب و تمدن کی بنا پر محروم کر دے گئے ہیں، مدعیان تہذیب کا دعویٰ ہے کہ انھوں نے انسانیت کے لئے ایک نہایت سچی راہ اختیار کر لی ہے، اور اپنے طریقہ تمدن سے انسانوں کو بیش بہا فائدہ پہونچایا ہے، لیکن کیا ہماری تہذیب کے تمام دعوے اور دنیا کو ایک مرکز پر لانے کی تمام کوششیں بحیثیت مجموعی نوع انسان کے لئے سودمند ہو سکتی ہیں۔ کیا ہم نے اطمینان قلب اور روح کی آزادی کے مسئلہ کا سچا حل دریافت کر لیا ہے؟

اس کے برخلاف تصویر کا دوسرا رخ بھی موجود ہے، دیہاتی آبادی کا معصوم طبقہ فطرت سے بہت زیادہ قریب سمجھا جاتا ہے، اس کی زندگی مصنوعی قوانین کی پابند نہیں ہوتی، اس کا ہر روز کا ایک سائل اس کو ایک خاص نظام کا قدرتی طور پر پابند کر دیتا ہے، اس کا سبزہ زاروں پر آزادانہ گشت کرنا، کھیتوں میں سخت مشقت برداشت کرنا، اور دن بھر کی تھکا دینے والی محنت کے بعد رات کو اپنے خاندان کے ساتھ بیٹھ کر روٹی کھانا زندگی کے اس دور کی یاد دلاتا ہے جب انسان نے تمدنی زندگی کی ابتدا کی تھی۔ اس کے بعد انسانوں کے ایک گروہ نے بزعم خود ترقی کی، اور اس نے اپنی زندگی میں بہت ساری اصلاحیں کیں اور غالباً ان نام نہاد اصلاحات کا یہ طویل سلسلہ ہمیشہ جاری رہے گا۔ اگر ان "اصلاحات" کا سلسلہ زندگی کے لئے خوشگوار ثابت نہیں ہوا ہے تو .... انسان ان ڈھکوسلوں میں کب تک مبتلا رہے گا؟

کیا دہقان صحیح راستے پر ہے؟ حسین وادیوں میں زندگی گزارنے اور اپنے لئے ایک قدرتی ماحول

تیار کر لینے کے بعد کیا اس کی تسلی ہوتی نظر آتی ہے؟........ دوسرے شہری انسانوں کی زرق برق پوشاک اور ان کے دوسرے عیش طلب لوازم حیات اس کو کس قدر دلچسپ نظر آتے ہیں! آرزو کی کشمکش اس کے دماغ میں ہمیشہ موجود رہتی ہے،

یہ کشمکش آخر کب تک جاری رہے گی اور انسان کا مقصود حیات کیا ہے؟......... انسانوں کا کوئی طبقہ کسی حالت میں بھی مطمئن نظر نہیں آتا! ۔

کیا ذہنی ارتقا کے ساتھ ساتھ ہم نے اپنے لئے یہ کشمکش کی دنیا پیدا کر لی ہے؟ کیا ہمارا بڑھتا ہوا نفق آگہی اور عقل کی روز افزوں کار فرمائیاں اس ساری بے اطمینانی کا باعث بن رہی ہیں؟

بچپن میں دن اپنے وسیع پھیلاو کے ساتھ کس قدر روشن اور شاندار نظر آتا تھا، ہر طلوع ہونے والی صبح اور ہر ڈوبنے والی شام اپنی نوعیت کے لحاظ سے بالکل یکسانیت رکھتی تھی، زندگی کی دوڑ دھوپ کے مستقل عذاب سے اس وقت بالکل امن تھا، کائنات کی روشن رنگینی ایک دلکش اور حسین خواب کی طرح تھی .... لیکن عقل و آگہی کی ترقی کے ساتھ ساتھ دن میں بھی تاریکی کے آثار نظر آنے لگے، زندگی کی ہر صبح اور ہر شام کے چہرے سے نقاب اٹھتے گئے، اور ان میں ایک دلچسپ امتیاز محسوس ہونے لگا اگر زندگی کا وہ دور اپنی پر کیف دلکشی کے لحاظ سے ایک با اطمینان زندگی کا معیار ہے تو پھر ساری زندگی اسی طرح ایک دلخوش کن خواب کیوں نہیں بن جاتی؟

کتنا آرام ہوگا انسان کی روح کو اس وقت! لیکن اگر یہ ممکن نہیں کہ انسان دنیا کو ایک شیریں خواب فرض کر لے اور اگر محنت اور عمل ہی مقصود حیات ہے تو اس کا نتیجہ سب کے لئے یکساں کیوں نہیں ہوتا، دنیا میں خوشی اگر کوئی چیز ہے تو محض خوشی ہی کا وجود کافی تھا، غمگینی کی کیا ضرورت تھی!

وہ کونسی طاقت ہے جس نے اتنا بڑا کاروبار دنیا میں پھیلا رکھا ہے، سورج مشرق سے طلوع ہونے کی بجائے مغرب سے کیوں نہیں نکلتا؟ ستارے اپنے محور پر کیوں قائم ہیں؟........ اور آپس میں

ٹکرا کر نظام کائنات کو برہم کیوں نہیں کر دیتے ؟ کائنات میں انسان کا وجود کیا حیثیت رکھتا ہے ؟ اور اس کا اس طاقت عظیم سے کیا تعلق ہے جو کائنات کو سنبھالے ہوے ہے"

کیا کبھی زندگی کا مسئلہ حل ہوگا' یا حل ہوتے ہوتے اپنی شکل یونہی بدلتا رہے گا ....!

واقعی .... کہہ سکے کون کہ یہ جلوہ گری کس کی ہے!

عمر مہاجر

جوانی

از

مخدوم محی الدین بی۔ اے (عثمانیہ)

بیدار ہوئیں پھر جوانی کی شعاعیں
پڑنے لگیں عالم کی اسی سمت نگاہیں

خوابیدہ تھے جذبات بدلنے لگے کروٹ
روئے شرر طور سے ہٹنے لگا گھونگٹ

بھرنے لگے بازو تو ہوئے بند قبا تنگ
چڑھنے لگا طفلی پہ جوانی کا نیا رنگ

ساغر کی کھنک بن گئی اُس شوخ کی آواز
بربط کو ہوئی گدگدی یا جاگ اُٹھے ساز

اعضا میں لچک ہے تو ہے اک لوچ کمر میں
اعصاب میں پارا ہے تو بجلی ہے نظر میں

بے باک نگاہوں پہ پڑا شرم کا آنچل
احساس کی دنیا میں مچی خوب ہی ہلچل

آنے لگی ہر بات پہ رک رک کے ہنسی اب
رنگین تموج سے گراں بار ہوئے لب

وہ دیکھ بدلتے ہوئے پہلو کوئی اُٹھا!
وہ دیکھ بگاڑے ہوئے گیسو کوئی اُٹھا!

وہ دیکھ کہ کس گل کی مہک پھیلی ہے ہر سو
وہ دیکھ کہ ہے کون رواں بجتے ہیں گھنگرو

کم بخت اجل تھی یہ جوانی کی قبا ہیں!
ٹکڑے ہیں کسی دل کے بھی نقش کف پا ہیں!

میرے چند دوست

از

سید اشفاق حسین متعلم سال چہارم

یہ کردار ہوسٹل سے متعلق ہیں

ایک دوست ہیں جو اپنی دانست میں مجھے کھلونا سمجھ کر مجھ سے کھیلتے رہتے ہیں اور میری بدقسمتی سے کہیں انھیں یہ خیال پیدا ہو گیا ہے کہ میں صرف ان ہی کی پذیرائی کے لئے پیدا کیا گیا ہوں۔ کسی زمانے میں خوشرو تھے۔ مگر اب تو ماضی کے مٹے مٹائے آثار کے سوا ان میں کچھ بھی نہیں اس پر بھی رات دن ان کی یہی کوشش ہوتی ہے کہ لوگ انھیں خوبرو سمجھیں میرے کمرے کی ہر چیز گویا ان کی اپنی ہے اور ان کی ہر چیز میرے سوا دوسروں کی۔ وہ جب چاہیں میرے کمرے میں آسکتے اور میری ہر چیز کو بغیر پوچھے لیجا سکتے ہیں مگر میں ان کے کمرے میں نہ بغیر اجازت جاسکتا ہوں نہ کسی چیز کو ہاتھ لگا سکتا ہوں ان کا لہجہ ہمیشہ تحکمانہ اور میرا تخاطب انکسارانہ ہونا ضروری ہے بھری محفل میں فقرے کستے ہیں، جانتے ہیں کہ میری زبان صرف انکی تعریف ہی کر سکتی ہے ان کے لطف و عنایت کی معراج یہی ہے کہ وہ میرے پاس آئیں، مسکراتے آتے ہیں گویا بجلیاں گرا رہے ہیں۔ اس وقت ان کی پذیرائی میرا فرض ہے اگر میں کبھی یہ شعر پڑھ دوں۔

اِک برق سر طور ہے لہرائی ہوئی سی　　　　دیکھوں ترے ہونٹوں پہ ہنسی آئی ہوئی سی

تو کچھ جھینپ، کچھ خشونت اور کچھ انداز برتری کے آثار ان کے چہرے پر ظاہر ہو ہو کر مٹتے ہیں۔ بیٹھتے ہیں تو گویا اس طرح کہ کسی اجنبی کے گھر بیٹھے ہیں۔ کبھی نگاہ التفات کی بارش ہوتی ہے تو کبھی تیر و نشتر سے میرے جگر کو چھلنی کیا جاتا ہے آخر بڑی رعونت سے اٹھتے ہیں اور اس انداز سے چل کر مجھے دیکھے بغیر گزر جاتے ہیں کہ گویا مجھ پر ایک آخری تیر چھوڑا جا رہا ہے۔ ان کے جاتے ہی مجھے ہنسی آتی ہے اس لئے کہ میں بھی انہیں دھوکا دے رہا ہوں۔ میرے ذوق نگاہ نے انہیں انداز تغافل کا عادی بنا دیا ہے۔ مجھے کس قدر مسرت ہوتی ہے جب مجھے یہ خیال آتا ہے کہ مستقبل قریب ہی میں، میں اپنی بے نیازی کا اعلان کر کے ان کی خود اعتمادی کو شکست دے رہا ہوں۔ مجھے حیرت ہے کہ میرے ذوق نگاہ کے فقدان پر وہ اپنے حسن کی کس کا فراوانی سے مجھے مسحور کر سکیں گے۔

ایک دوست ایسے ہیں جو مجھ سے ہر وقت روٹھے رہتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ میں ان سے بہت زیادہ قریب ہوں، میری ہر غیر ذمہ دارانہ حرکت پر وہ پردہ کرتے ہیں اور میری بے راہ روی پر انھیں دلی صدمہ ہوتا ہے۔ زندگی کی ناخوشگواریوں میں اکثر میں نے انھیں کے خلوص میں پناہ لی ہے۔ جب وہ روٹھ کر مٹتے ہیں تو ان کی نگاہیں میرے دل کی تاریکی میں اجالا کر دیتی ہیں۔ اپنے ماحول سے کبھی خوش نہیں رہ سکتے اکثر دوست ان کی نازک مزاجی سے ڈرتے ہیں، اس حد تک نازک مزاج ہیں کہ دوسروں کے جذبات کو روند کر بھی خود ہی روٹھ جاتے ہیں۔

خوش وضع ہیں مگر اس قدر اپنے آپ سے بے خبر کے آفتاب ہو کر ذرّوں کو ڈھونڈتے پھرتے ہیں اکثر پرشوق نگاہیں ان کی خمار آلود نگاہوں سے ٹکراتی ہیں مگر وہ ہیں کہ

ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے
بے نیازی تری عادت ہی سہی

گنگناتے رہتے ہیں۔ اس دلچسپ انداز میں اپنی بے بسی اور دوسروں کی ستم شعاری کا ذکر

فرماتے ہیں کہ اہل دل حضرات لوٹ لوٹ جاتے ہیں۔ افسوس اس کا ہے کہ وہ دوسروں کے لئے سب کچھ ہیں اور اپنے لئے کچھ بھی نہیں۔ ان کی اس بے خبری ہی میں اتنی خود آرائی چھپی ہے کہ جب وہ مضطرب ہو کر

کلجوا میں ہے رام لگ گئی چوٹ

الاپتے ہیں تو اچھے اچھوں کے دل ہل جاتے ہیں بعض وقت وہ زندگی سے بیزاری کا اظہار کرتے ہیں تو ایسے ویسوں کو تو زندہ رہنے اور زندگی گزارنے کی ذرہ بھر ہوس نہیں رہتی۔

اتنے بے پروا اور بے فکر ہیں کہ دنیا میں قیامت برپا ہو جائے آسمان اور زمین آپس میں ٹکرا جائیں ہوسٹل کی عمارت گر پڑے مگر وہ ہیں کہ ہنستے ہی رہیں۔ وہ اس حد تک تو وقت کے اتنے پابند ہیں کہ دس بجے سے پہلے کبھی جاگ نہیں سکتے مگر جب جاگتے ہیں تو ساری خوش فعلیاں ان کے ساتھ جاگ اٹھتی ہیں۔ زندگی نے انھیں صرف دو کام تفویض کئے سونا اور ہنسنا ہنسانا بہت سے غمزدہ اور فکر کے مارے انھیں ہنستا دیکھ کر جی اٹھتے ہیں مگر کچھ ایسے بھی ہیں جو ان سے حد درجہ تنگ ہیں اس لئے کہ یہ جہاں جاتے ہیں اپنی ہنسی کمرے میں چھوڑ کر نہیں جاتے۔ بعض سنجیدہ اور محنتی طالب علم جو ہنسنے سے زیادہ وقت کی کمی کا رونا روتے رہتے ہیں انھیں اس طرح ہنستا دیکھ کر کڑھتے ہیں یہ وقت کی پابندیوں سے ہمیشہ بے نیاز رہے، اس لئے وقت بھی ان کے پاس سے رک رک کر گزرتا ہے اور یہ جتنا جی چاہتا ہے خوشی کی گھڑیوں سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ اور جب جھک جاتے ہیں تو سو جاتے ہیں۔ حال کے سوا ماضی کی یاد اور مستقبل کا خیال ان کے نزدیک کوئی چیز نہیں۔ بہت سوں نے کوشش کی کہ انھیں کبھی غمگین بھی دیکھیں مگر یہ اس کا موقع ہی نہیں آنے دیتے۔

ایک زمانے کے ساتھی ہیں۔ عیش کی محفلوں اور رنج کی گھڑیوں میں بھی میرا اور ان کا ساتھ نہ چھوٹا میں نے کوشش کی کہ ہمیشہ کے لئے ان کا ہو جاؤں مگر وہ اکثر اپنا دامن بچا کر۔

"میرا دامن چھوڑئیے، اپنا گریبان پھاڑ ئیے"

کہہ کر بھاگ گئے رہے۔ میں گریباں تو کیا پھاڑتا، ہاں ان کا تعاقب ضرور کرتا رہا یہاں تک کہ تھک کر بیٹھ گیا۔ زمانے کے ساتھ خیالات بھی بدلتے رہے، وہ ابھی تک بھاگے جا رہے تھے اور میں اپنی

کوشش ختم کرچکا تھا۔ میں انھیں دور سے دیکھنے کا عادی ہوچکا تھا اور وہ سمجھ رہے تھے کہ میں ابھی تعاقب ہی کررہا ہوں۔ غرض ایک منزل پر پہنچکر ان کے بھی قدم ڈگمگاتے نظر آئے۔ مگر اب ان میں اور مجھ میں ایک خلیج حائل تھی جس کو نہ میں پار کرنا چاہتا تھا نہ وہ کرسکتے تھے۔ غرض اسقدر قرب کے بعد اتنا بعد ان کے لئے ایک تازیانہ تھا۔ وہ پیچھے لوٹ رہے تھے، مگر میں ان پر سے نظریں ہٹا چکا تھا، ان کا شوق بڑھتا رہا اور وہ مجھ سے قریب ہوتے گئے وہ خلیج پار کرچکے تھے کہ میں سرپٹ دوڑا اور اب حالت یہ ہے کہ میں بھاگ رہا ہوں اور وہ کبھی رکتے ہیں اور کبھی تعاقب کرتے ہیں۔ میں جب ان کے کردار پر غور کرتا ہوں تو سوائے اس کے کچھ بھی معلوم نہیں کرسکتا کہ وہ ایک ایسے دوست تھے جو ہر راستہ چلنے والے کا دوست بن جاتا ہے۔

بہت معقول آدمی ہیں "پڑھنے کے وقت پڑھتے اور کھیلنے کے وقت کھیلتے ہیں" اپنے اوقات سے بچوں کی طرح کھیلتے نہیں بلکہ بوڑھوں کی طرح سبق حاصل کرتے ہیں۔ دوسروں کی کامیاب زندگی پر وہ رشک کرتے اور آگے بڑھتے ہیں۔ مگر دوسروں کو ڈھکیل کر یا گرا کر آگے بڑھنا نہیں چاہتے بلکہ خاموشی ہی میں اپنا راستہ پیدا کرتے ہیں۔ زندگی کے ہر سانس کو عمر جاوداں سمجھ کر بڑے بڑے کام انجام دینے کی آرزوئیں ان کے پر جوش سینہ میں اٹھتی رہتی ہیں۔ دوسروں کو اپنا بنانے میں انھیں ملکہ حاصل ہے اور ہر شخص ان کی مرنجان مرنج طبیعت سے خوش رہتا ہے۔

اتنے پرجوش کہ کام کرنے پر آئیں تو رات رات بھر کام کرتے رہیں پھر چاہے وہ باتیں کرنے کا کام ہو یا لکھنے کا۔ بعض وقت اتنے خاموش کہ لوگ ان سے ہمکلامی کے لئے ترس ترس جاتے ہیں مگر وہ ستم ظریف ایسے کہ نہ بولتے ہیں نہ سنتے ہیں۔ رات بھر جاگنا اور دن بھر سونا ان کی عادت ہے۔ مگر جب اس زندگی سے اکتا جاتے ہیں یا شور و غل اور ہنگاموں سے گھبرا اٹھتے ہیں تو کسی کو دیکھنے تک کے روادار نہیں ہوتے۔ آخر اس سے بھی بیزار ہو جاتے ہیں اور پھر پورے جوش و خروش کے ساتھ گرجتے اور برستے رہتے ہیں ان کے سارے دوست ان سے خوش اور وہ بھی سب سے خوش۔ دشمنوں کے بڑے سخت دشمن ہیں۔ دوست کے لئے

جان دینا اور دشمن کی جان لینا ان کے نزدیک ایک معمولی بات ہے ۔

خطرناک حد تک اصولی آدمی ہیں یہی وجہ ہے کہ وہ میرے افتاد طبع سے ہر وقت نالاں اور ان کے احتساب بیجا سے میں ہر لمحہ تنگ رہتا ہوں ۔ وہ مجھ سے کہتے ہیں کہ "تم زندگی کو کھلونا سمجھ کر ہر وقت کھیلتے رہتے ہو" اور حال کی خوش فہمیوں میں مجھے اتنا سوچنے کی بھی فرصت نہیں کہ زندگی ایک کھلونے کے سوا کچھ اور بھی ہے ۔ مجھے خبر ہی نہیں ہوتی کہ کب صبح ہوئی اور کب سورج غروب ہوا مگر وہ اتنے باخبر کہ ان کا ایک لمحہ بھی بغیر ان کی اجازت کے نہیں گزرتا میں اپنی مصروفیات میں اکثر انہیں بھول جاتا ہوں مگر وہ مجھے اپنے سے زیادہ یاد رکھتے ہیں میں جب ہا ہو کی زندگی سے گھبرا جاتا ہوں تو اکثر ان ہی کے خاموش کمرے کا سہارا ڈھونڈتا ہوں ۔ ان کے چہرے پر فتح کی ایک ہلکی مسرت چمک اٹھتی ہے جب وہ مجھے مصروف مطالعہ دیکھتے ہیں ۔ میں ان کی بڑی عزت کرتا ہوں اس لئے کہ بعض وقت جب ان کی طبیعت موزوں رہے تو وہ میری کتابوں اور کمرے کی بے ترتیب چیزوں کو اصول اور ترتیب سے رکھتے ہیں اور مجھے یہاں ان کی فرشتہ صفتی کا قائل ہونا پڑتا ہے ۔

دبلے پتلے آدمی ہیں مگر اپنی ہمت بلند کے سہارے پہاڑوں سے ٹکراتے ہوئے بھی نہیں ڈرتے کبھی نچلے نہیں بیٹھ سکتے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے جسم میں بجلیاں کوٹ کر بھر دی گئی ہیں شکستوں پر شکستیں کھاتے ہیں مگر ان کے پر جوش ارادوں میں ذرا بھی اضمحلال پیدا نہیں ہوتا جذبات سے زیادہ عقل کے زیر اثر ہیں ہمیشہ ہمت سے زیادہ کام کر جاتے ہیں اسی لئے اکثر ناکام رہتے ہیں مگر شکست کے بعد ان کی روانی اور بڑھ جاتی ہے ۔ اپنے مصالح کے آگے انہیں کسی کی پروا نہیں ہوتی مگر جب عقل کے ہتھکنڈوں سے تنگ آتے ہیں تو جذبات ہی کا سہارا ڈھونڈتے ہیں اس وقت اپنے ندامت آمیز تبسم اور عفو طلب نگاہوں سے اپنی ساری گزشتہ خطائیں بخشوا لیتے ہیں ۔

ایسے دوست ہیں جن کی ذات میں میں وہ سب کچھ دیکھتا ہوں جسے دیکھ کر مجھے زندگی بہت قیمتی معلوم ہونے لگتی ہے ۔

وہ ہمیشہ جوانی کے ترنگ میں مدہوش اور بے پئے ہی مست رہتے ہیں ۔ ان کی زندگی سے بہنے

اپنی پستی میں بھی بلندی کا سبق حاصل کیا۔ اور اس وقت جب کہ قریب تھا کہ میں راستے کے نشیب و فراز سے گھبرا کر پست ہمت ہو جاؤں، انھوں نے مجھے سہارا دیا۔ زندگی کی سخت سے سخت گھڑیوں میں بھی میں نے ان کے ماتھے پر کبھی شکن نہ دیکھی۔ ان کی زندگی میں اتنے انقلاب آئے اور زمانے کی تیز و تند ہوا نے انھیں خوب خوب جھنجوڑا اور ہچکولے دئیے مگر ان حوادث میں بھی وہ ایک چٹان کی طرح مستقل مزاج اور ایک سرسبز درخت کی طرح شاداب رہے۔ ان کو دیکھ کر مردہ جی میں امنگیں جاگ اٹھتی ہیں اور ان کی باتیں سن کر مستقبل خوش آیند نظر آنے لگتا ہے۔ وہ جب سینہ ابھار کر چلتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس سیلاب زندگی میں وہ دھارے کو چیر کر اپنا راستہ پیدا کر رہے ہیں اور ان تنکوں کو بھی سہارا دے رہے ہیں جو دھارے کے ساتھ بہے جا رہے ہیں ان کے لئے اعتراف شکست موت سے بڑھکر ہے، وہ شکستہ پائی میں بھی ایڑیاں رگڑ رگڑ کر زمزم کی لہر پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ ایثار و قربانی اس حد تک کرتے ہیں کہ بعض وقت ان کے مقاصد خود معرض خطر میں پڑ جاتے ہیں ان کی روشنی میں چاندنی کی سی مٹھاس اور ٹھنڈی چھاؤں کا سا آرام میسر آتا ہے۔

پردیسی پریتم

صمد صاحب کا شمار کلیہ کے اچھے شعراء میں ہوتا ہے پہلے آپ "غمگین" تخلص کرتے تھے لیکن اب آپ کی تشنہ مزاجی نے آپ کو "ساز" میں تبدیل کر دیا ہے، آئندہ سے آپ کا شاعرانہ نام "ساز" ہی ہوگا۔

ادارہ

برکھا رت کی مستی چھائے — کالی کالی بدلی آئے
بوندیں برسیں ننھی ننھی — موتی برسیں گنگا جمنی
اڑتے ہوں بگلے اجلے اجلے — بجلی چمکے بادل گرجے
جھوم رہی ہو ڈالی ڈالی — پتی پتی ہو متوالی
پیاری پیاری چڑیاں گائیں — میٹھے میٹھے راگ سنائیں
ندی نالے شور مچائیں — جنگل بولے سائیں سائیں

اور نہ ہو تم میرے دھورے
پھر بھی دل میں درد نہ اٹھے

پھر بھی میری آنکھ نہ روئے — اشکوں سے چہرے کو نہ دھوئے
قمری سرو پہ جب اڑتی ہے — ہوک سی اک دل میں اٹھتی ہے

خاک پڑے ایسی برکھا پر — اِک اِک پل ہے جینا دوبھر
آگ لگے اس برکھا رت کو — تم بن نینن پھوٹیں رو رو
ایسے سمے میں یاد تمہاری — میں دکھیاری بپت کی ماری

پردیسی بیتم آجاؤ
نینن ترسیں مکھ دکھلاؤ

صمد رضوی "ساز"

حیدرآباد کی جدید اردو مطبوعات

از

ڈاکٹر سید محیؔ الدین قادری زورؔ

۱۔ مختصر تاریخ دکن۔ ۲۔ نظام علی خاں حصۂ دوم۔ ۳۔ ابطال مادیت۔ ۴۔ حیدرآباد دکن کی تعلیمی ترقی

مختصر تاریخ دکن۔ برائے مدارس سرکار عالی و افادہ عامہ۔ مولفہ مولوی ہارون خاں صاحب شروانی، ام اے، بیرسٹر، پروفیسر تاریخ جامعہ عثمانیہ۔

یہ ۲۰۷ صفحات (دو پونیا تقطیع) کی کتاب ہے جس میں دکن کی تاریخ کو دلچسپ پیرایہ میں بیان کیا گیا ہے۔ مولف نے اس کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا حصہ "قدیم زمانہ" سے متعلق ہے جو سنہ ۱۳۴۵ء میں ختم ہوتا ہے۔ دوسرا حصہ "زمانہ وسطی" سنہ ۱۷۲۴ء پر ختم ہوتا ہے اور تیسرا "زمانہ حالیہ" ہے پہلے دو حصوں میں پانچ پانچ باب ہیں اور آخری میں سات۔ دوسرے اور تیسرے حصوں کے آخر میں تتمے بھی شامل ہیں جن میں بہمنیہ، بریدیہ، عماد شاہیہ نظام شاہیہ، عادل شاہیہ، قطب شاہیہ، تیموریہ، اور آصفیہ سلاطین کے شجرے درج ہیں اور گورنر جنرلان و وایسرایان ہند کی فہرست بھی۔

اس چھوٹی سی کتاب کا اسلوب اسقدر شگفتہ ترتیب مضامین اتنی باضابطہ، اور طباعت و کتابت ایسی پاکیزہ ہے کہ اس موضوع پر شاذ ہی کوئی اور کتاب ایسی مل سکے۔ نہ صرف مدرسوں کے طالب علم بلکہ کالج کے طلبہ اور اس ملک کے حالات سے عام دلچسپی رکھنے والے بھی اس کے مطالعہ سے برابر مستفید ہو سکتے ہیں۔

اس کتاب میں اس ملک کی تمدنی تاریخ پر بھی زور دینے کی کوشش کی گئی ہے اور اس امر کا بھی خیال رکھا گیا ہے کہ "بچوں کو یہ بتانا چاہیے کہ اس ملک والوں نے تہذیب و تمدن کے میدانوں میں کس قسم کے کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں"

مگر اس التزام کے باوجود بیجاپور اور گولکنڈہ کی سلطنتوں کے ذکر میں ان کی قدردانی علم و فضل اور اردو زبان کی لازوال خدمت کا شایان شان تذکرہ نہیں ہے اسی طرح حیدرآباد اور بیجاپور کی عظیم الشان عمارتوں کے سلسلہ میں دکنی طرز تعمیر کی خصوصیات اور اس کی انفرادیت کی طرف بھی اشارہ کرنا ضروری ہے دکنی سلطنتوں کے زوال کے ذکر میں اسی قدیم نقطۂ نظر کو ملحوظ رکھا گیا ہے جو مغل شہنشاہیت کی فتح و کامرانی کو ہر چیز پر مقدم سمجھتا ہے۔ اس حصۂ کتاب کے مطالعہ سے قطب شاہیوں اور عادل شاہیوں کی نسبت زیادہ اچھے خیالات قایم نہیں ہوتے۔ دکن کی ہر جدید طرز کی تاریخ میں ان شدید نقصانات کا تذکرہ ضروری ہے جو دکن کے علم و فضل، تمدن و تہذیب، اور گنجینہ ہائے فنون لطیفہ کو مغل فوجوں کے دست تعدی نے پہنچائے تھے۔ ان امور کے قطع نظر پروفیسر ہارون خاں صاحب کی مختصر تاریخ دکن نہایت مفید اور دلچسپ ثابت ہوگی۔ یہاں اس کی ایک عبارت نقل کیجاتی ہے جس سے ظاہر ہوگا کہ اس کتاب کا پیرایۂ بیان کتنا دلنشین ہے"

"اگر ہم ان فرامین کو دیکھیں جو ہمارے بادشاہ نے ہماری بہتری کے لئے وقتاً فوقتاً شایع کئے ہیں تو ہمیں ان کی محبت اور شفقت کا اور بھی زیادہ اندازہ ہوجائے گا۔ وہ ہر ایک مذہب کو ایک ہی نظر سے دیکھتے ہیں اور گو وہ اپنے پیارے مذہب اسلام پر دل و جان سے فریفتہ ہیں لیکن ان کے حکم سے دیولوں،

گرجاؤں اور گردواروں، عیسائیوں، سکھوں اور ہندوؤں کی مذہبی اور دنیوی انجمنوں، اور مدرسوں کے لئے لاکھوں روپیہ خرچ ہوتا ہے۔ اور حال کے ایک فرمان مبارک کے ذریعہ سے یہ اعلان کردیا گیا ہے کہ انتظام معاملات میں تمام مذاہب کے پیروں کو بالکل ایک ہی نظر سے دیکھا جائے گا۔ ایک دوسرے فرمان مبارک کا منشاء ہے کہ ممالک محروسہ کے خدمات پر جو تقررات ہوں گے ان میں یہاں کے باشندوں کو باہر والوں پر ترجیح دی جائے گی"۔

نظام علی خاں حصہ دوم۔ مولفہ مولوی سراج الدین صاحب طالب (رائل سائز ۸۔۳۰ صفحات)

چند سال قبل اس کتاب کا پہلا حصہ شایع ہوا تھا جس میں حضرت آصفجاہ ثانی کے سوانح حیات کے وہ واقعات مندرج تھے جو ان کی تخت نشینی کا باعث ہوئے۔ اس دوسرے حصہ میں اس کے بعد سے ان کی وفات تک کے واقعات درج کئے گئے ہیں۔ خود اس حصہ کو مولف نے دو ادوار میں تقسیم کردیا ہے پہلا دور (۱۸ صفحات) رکن الدولہ کی دیوانی پر مشتمل ہے۔ اور دوسرا دور (۱۵ صفحات) ارسطو جاہ کی دیوانی سے متعلق۔ آخر میں (۵۰ صفحات) میں ضمیمہ اور اشاریہ درج ہے جو تاریخ دکن پر تحقیق و تفتیش کرنے والوں کے لئے نہایت مفید ثابت ہوگا۔

اس کتاب کی ترتیب نہایت اعلیٰ اور انداز بیان نہایت سنجیدہ ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مولوی سراج الدین صاحب نے تاریخ دکن کے اس عہد کو اپنے لئے مخصوص کرلیا ہے۔ چنانچہ اس وقت تک اس کے متعلق ان کی دوسری دو تین کتابیں "شیر جنگ" "میر عالم" اور "دکن کی تاریخی کہانیاں"، وغیرہ بھی شایع ہوچکی ہیں۔ ان کتابوں کی تیاری میں انھوں نے نواب سالار جنگ، نواب معین الدولہ، اور دفتر دیوانی ومال وملکی وغیرہ کے کتب خانوں کی کمیاب اور انمول تاریخی کتابوں اور کاغذات سے استفادہ کیا ہے اور اسطرح اس وقت تک ان موضوعوں سے متعلق انہی کا پیش کیا ہوا مواد سب سے زیادہ مکمل اور مستند سمجھا جاسکتا ہے

مولوی سراج الدین صاحب کا نقطہ نظر بہت صحیح اور ملک کی موجودہ ضروریات کے مطابق ہے وہ ایک اچھے انشاء پرداز بھی ہیں چنانچہ ان کتابوں سے پہلے مختلف رسائل میں ان کے متعدد مضامین

شایع ہوتے رہے ہیں ۔

تاریخ دکن سے ہر ایک دلچسپی رکھنے والا اس کتاب کے مطالعہ سے ضرور متاثر گا اسکو معلوم ہوگا کہ دور آصفیہ سے متعلق بھی اس وقت تک ہماری معلومات کتنی ناقص ہیں اور ہمیں کس قسم کی کتابوں کی ضرورت ہے ۔ کیا ہی بہتر ہو کہ سراج الدین صاحب ہی دوسرے تاجداران آصفی پر بھی اسی طرح ایک ایک کتاب مرتب کر دیں اور اس طرح اس دور کی تاریخ دکن مکمل ہو جائے ۔

افسوس ہے کہ اس کتاب میں نظام علی خاں اور ان کے عہد کی علمی سرگرمیوں اور اردو شعر و سخن کی سرپرستیوں کا خاطر خواہ ذکر نہیں کیا گیا حالانکہ اس عہد میں اردو شاعروں کی بے نظیر سرپرستی کی گئی ہے اور دکن کی قدر دانی سخن کا شہرہ سن کر اس زمانہ میں اقصائے ہندوستان سے باکمال شعرا کی دکن میں آمد شروع ہوئی ہے ۔

شعر و سخن، علم و فضل، اور تہذیب و تمدن کے ارتقا اور رجحانات کے ذکر کیے بغیر کسی عہد کی کوئی تاریخ مکمل نہیں ہو سکتی ممکن ہے مولوی سراج الدین صاحب اس کتاب کا ایک تیسرا حصّہ لکھکر اس عیب کو دور کر دیں ۔

ابطال مادیت ۔ مولفہ ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب منشی فاضل، ام ۔ اے، پی ۔ ایچ ۔ ڈی، بیرسٹرایٹ لا استاذ فلسفہ جامعہ عثمانیہ

یہ ۶۰ صفحات (دو نیا تقطیع) کی ایک چھوٹی سی کتاب ہے جس کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ جامعہ عثمانیہ کے فارغ التحصیل اپنی اپنی فضا مین کس خوبی سے سرگرم کار ہیں ۔ انھوں نے علوم و فنون اور فلسفہ و حکمیات میں نہ صرف دسترس حاصل کر لی ہے بلکہ اپنی آئے دن کی تحقیقات و مساعی کے ذریعہ سے ان میں اضافہ بھی کر رہے ہیں اس سے قبل ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب کی دوسری دو تین کتابیں مثلاً "مقدمہ مابعد الطبیعیات" اور "برگسان" وغیرہ شایع ہو چکی ہیں لیکن یہ کتاب اپنے خاص موضوع کے لحاظ سے اہل مشرق اور خاص کر دنیائے اُردو میں دلچسپی سے پڑھی جائے گی ۔ اس میں مادیت کی تعریف اور تاریخ بیان کرنے کے بعد مادیت

کی نظر میں کائنات کی تصویر اور مادیت و اخلاق پر بحث کی ہے اور آخر میں ان امور پر تنقید کی ہے کہ مادہ کیا ہے؟ کیا مادیت صفات کی توجیہہ کر سکتی ہے؟ اور کیا مادیت ذہن کی توجیہہ کر سکتی ہے؟ ان مباحث کے بعد خاتمہ میں لکھا ہے کہ:-

"مادیت کے اس بسیط مطالعہ کے بعد ہم کس صداقت تک پہنچنے کی امید کر سکتے ہیں؟ خود مادیت کا 'صداقت' کے متعلق کیا بیان ہو سکتا ہے؟ ہم جانتے ہیں کہ مادیت کی رو سے فکر یا خیال نتیجہ ہوتا ہے ایک سابقہ علت کا اور اگر ہم اس علت کو بدل دیں تو فکر یا خیال بھی بدل جائیگا۔ انسان کا فلسفہ نتیجہ ہوگا ان علل کا جو اس پر اثر انداز ہوتے ہیں جن میں موروثی طبیعت بھی شامل ہوتی ہے چنانچہ ہندوں کا تصوف ان کی کمزور کرنے والی آب و ہوا کا نتیجہ ہوگا اور شوپنہور کی جگر سوز قنوطیت اس کے بگڑے ہوے جگر یا معدہ کی زائیدہ اور نہ معلوم خود مادیت کس قسم کے مزاج کا نتیجہ ہوگی، شاید ولیم جیمس کی تحقیق صحیح ہو اور مادیت شقیق القلبی کا نتیجہ ہو جس طرح تصوریت رقیق القلبی کا ہے لیکن اگر فلسفہ ان علل و اسباب کا نتیجہ قرار دیا جائے تو پھر ہمیں اس کی صداقت کے متعلق کس قسم کی ضمانت حاصل ہو سکتی ہے؟ کیا ہمارا یہ خیال صحیح ہو سکتا ہے کہ صداقت آب و ہوا کے تغیر کے ساتھ نہیں متغیر ہوتی؟ منطق کے اصول ضرب کی تختی خط استوا میں بھی وہی کام دیتے ہیں جو قطبین میں۔ کیا مادیت فکر کی علت و معلول کے طریقہ پر توجیہہ کر کے خود اپنے معاملے کو کمزور نہیں کر دیتی؟

ان چیزوں پر غور کرنے سے ہم یہ ماننے پر مجبور ہوتے ہیں کہ مادیت نے نظام کائنات کی جو توجیہ پیش کی ہے وہ کسی طرح کامل یا کامیاب نہیں۔ مادیت کی کمر کئی جگہ سے ٹوٹتی ہے۔ ومیقراطیس نے مادہ کا جو تصور پیش کیا تھا جو انیسویں صدی تک قابل قبول سمجھا گیا وہ بیسویں صدی میں آکر مردہ قرار پایا۔ اگر مادہ کے یہی معنے لئے جائیں جو دیمقراطیس نے بتلائے تھے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ مادیت اب باقی نہیں رہی کیونکہ اس قسم کی مادیت کو نہ عالم طبیعیات ہی مانتا ہے اور نہ فلسفی۔ سائنٹفک تحلیل "مادہ" سے بہت آگے نکل گئی ہے۔ اگر ہم مادہ کے بجائے "برق" کہیں تو پھر بھی ہم نے دیکھا کہ برق کے علاوہ اور حقائق کا وجود ہے۔ خود ایجابی و منفی برق دو جدا حقائق ہیں۔ پھر ایتھر ہے، پھر توانائی۔ پھر ذہن کا وجود کسی طرح

مادہ میں تحویل نہ ہوسکا۔ مادیت کے لئے یہ ایک عقدۂ لانیحل ہی رہا مادیت نے اس کی توجیہ میں زیادہ ادعائیت اور کم عقل سے کام لیا۔!

لیکن جیساکہ پروفیسر پیٹرک کہتا ہے کہ کیا فلسفہ کے مطالعہ کرنے کا یہ طریقہ سودمند ہے کہ ہم اپنے تجربہ کی اس تنوع و مالامال دنیا کو چند بے جان عناصر یا اکائیوں میں تحویل کردیں؟ کیا کوئی ایسا علم بھی ہے جس کو وجودیات کہا جاسکتا ہے؟ شاید حقیقت کی تلاش واقعات (ایونٹس) میں کی جانی چاہئے نہ کہ اصول اولیہ' میں ممکن ہے کہ برق' توانائی' ایتھر نہ انتہائی حقائق ہوں اور نہ اولین اولیات۔ شاید علماء ریاضیات کا مکان۔زماں والا انکشاف ہمیں علماء طبیعیات کے برقی اکائیوں سے زیادہ اولین مواد تک پہنچائے۔ شاید حقیقت کا پتہ تحلیل' سے نہ چلے بلکہ ترکیب سے مل جائے یا اگر ہمیں یہ سمجھنا ہی ہے کہ کسی زمانے میں صرف چٹانیں ہی تھیں یا زمین اور پانی' نہ حیات کا وجود تھا اور نہ ذہن کا' تو شاید چٹانیں' زمین اور پانی عمل کائینات میں محض ایک اسٹیج ہوں' ارادۂ تخلیقی کا تھوڑی دیر کے لئے قیام گاہ' گویا کہ وہ حیات' ذہن معاشرت کا ایک زینہ تھے۔ تو پھر ہم کہہ سکتے ہیں کہ حیات ذہن اور معاشرت حقائق ہیں اور ذرات اور برقیے محض ضروریات یا لوازمات!"

یہ امر حیدرآباد کے ذی مقدرت اصحاب اور امراء کے لئے لائق تقلید ہے کہ اس کتاب کی طباعت واشاعت نواب لطف الدولہ بہادر امیر پائیگاہ اور صدر المہام عدالت و فوج کی مربیانہ توجہ کی مرہون منت ہے اس کتاب کا بھی اسلوب نہایت دلکش ہے جیساکہ منقولہ عبارت سے ظاہر ہوگا۔ یقین ہے کہ اس کے مطالعہ سے اکثر سنجیدہ ذوق رکھنے والے اصحاب مستفید ہوں گے۔

فلسفہ کے میدان میں کام کرنے کی بہت کچھ گنجائش ہے۔ مشرق کو فلسفہ سے نہایت قدیم تعلق ہے۔ کسی زمانے میں متعدد مسلمان علماء نے بھی اس کی خدمت کی ہے۔ یہ سب امور اب گلدستۂ طاق نسیان بن گئے ہیں مگر کیا تعجب ہے کہ ڈاکٹر ولی الدین صاحب اور ان کی رہبری یا تقلید میں دوسرے برادران جامعہ اس موضوع پر بھی اُردو میں مفید معلومات کا اضافہ کردیں۔

حیدرآباد دکن کی تعلیمی ترقی۔ گزشتہ ربع صدی میں۔ مولفہ مولوی عبدالقادر صاحب سروری ایم اے، ایل ایل۔ بی مددگار پروفیسر اُردو جامعہ عثمانیہ

یہ ۱۳۶ صفحات (یونیا سائز) کی کتاب ہے جس میں آٹھ عنوانوں (۱۔ تعلیم زمانہ سابق میں۔ ۲۔ عام تعلیم کی طرح اندازی۔ ۳۔ تعلیم مستحکم بنیادوں پر۔ ۴۔ عبوری زمانہ۔ ۵۔ دور تحریکات۔ ۶۔ جامعہ عثمانیہ ۷۔ اُردو ذریعہ تعلیم۔ ۸۔ جامعہ کے قیام کے بعد) کے تحت میں حیدرآباد کی تعلیمی ترقیوں کے اسباب وعلل اور نتائج پر نہایت خوبی کے ساتھ اجمالی طور پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہ کتاب اُردو زبان میں اس موضوع پر پہلی کوشش ہے۔ اس میں بعض ایسے مفید نقشے بھی شامل کئے گئے ہیں جن کے مطالعہ سے حیدرآباد کی تعلیمی رفتار اور اُردو اور انگریزی زبانوں کے متعلمین کے اعداد وغیرہ کی نسبت معلومات حاصل ہوتی ہیں۔

کتاب کی ترتیب نہایت عالمانہ اور اسلوب سنجیدہ ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ مواد کی فراہمی اور صحت کا خاص طور پر خیال رکھا گیا ہے۔ ریاست کے سرکاری سنہ فصلی کے ساتھ ساتھ مطابقت کے لئے سنہ عیسوی بھی ہر جگہ درج کیا گیا ہے جس کی وجہ سے بیرون حیدرآباد کے تعلیمی دلچسپی رکھنے والے اصحاب اور ماہرین تدریسیات کے لئے یہاں کی تحریکات اور تعلیمی ترقیوں کے مختلف مدارج کے سمجھنے میں آسانی ہوگئی ہے۔

اس کتاب میں ان خاص خاص ماہرین تدریسیات ومحسنین تعلیم کے حالات وخیالات اور ان کی مساعی پر بھی ایک سرسری تبصرہ کرنے کی ضرورت تھی جنھوں نے اپنی پرخلوص اور مسلسل کوششوں کے ذریعہ سے حیدرآباد کے تعلیمی مستقبل کو تابناک بنادیا اور جن میں سے بعض اب تک سرگرم کار ہیں۔ اسی طرح بعض اعلیٰ پایہ کے مدارس اور وہاں کے معلمین ومتعلمین یا ان سے متعلقہ بزموں اور انجمنوں وغیرہ کی خصوصیات اور سرگرمیوں کی نسبت بھی کچھ نہ کچھ معلومات کا شامل کرنا اس موضوع کی تکمیل کے لئے ضروری تھا۔ بحالت موجودہ یہ کتاب حیدرآباد کی تعلیمی ترقی پر ایک ایسے ذمہ دار ماہر تعلیم کا تبصرہ معلوم ہوتی ہے جو تحریکات اور واقعات پر محض فنی نقطۂ نظر سے بحث کرنا چاہتا ہے لیکن اس خشک التزام کے باوجود لکھنے والے کا دلچسپ اسلوب بیان اور انشا پردازی کی قوت جگہ جگہ اپنی جھلک دکھلاتی ہے۔ اس کے آخری حصہ سے ایک مختصر عبارت کا اقتباس یہاں پیش کیا جاتا ہے جو مصنف کے دلکش طرز تحریر کا نمونہ ہے۔

"اس موضوع سے متعلق ایک اور رسالہ "منتظم" بھی چند سال پہلے مولوی حفیظ اللہ میر صاحب کی ادارت میں جاری ہوا تھا۔ طالب علموں کی دلچسپی کے مضامین اس میں شایع ہوتے تھے۔ چند اشاعتوں کے بعد یہ رسالہ بند ہوگیا اس سلسلہ میں دو قدیم تر رسالوں کا ذکر بھی ضروری ہے، جو خصوصی تعلیمی رسالے تو نہیں ہیں لیکن ان سے کم سن طلبہ کو بہت فائدہ پہنچا۔ ان میں پہلا رسالہ "ادیب الاطفال" ۱۹۰۷ء میں جاری ہوا تھا۔ اس کے مدیر احمد اللہ بیگ صاحب اور نائب مدیر مسٹر رگھوناتھ راؤ درد تھے۔ دوسرا رسالہ "نونہال" کوئی پندرہ سال پہلے مولوی مرغوب الدین صاحب کی ادارت میں نکلتا تھا۔ کئی سال تک جاری رہا۔ اب چند سال سے یہ بند ہوگیا ہے۔

موجودہ حیدرآباد کا ربع صدی کا پہلے کے حیدرآباد سے مقابلہ کیجئے تو ایک جہاں کا تفاوت نظر آئیگا۔ ایک زمانہ وہ بھی تھا کہ خود ملک کا جدید نظم و نسق چلانے کے لئے انگریزی تعلیم یافتہ افراد کی کمی محسوس ہوتی تھی اور اسی لئے سالار جنگ مرحوم کو، جن کے عہد میں جدید نظم و نسق رائج ہوا، حکومت ہند سے مدد لینے کی ضرورت پڑتی تھی۔ آج حیدرآباد اپنے قابل فرزندوں کے ذریعہ نہ صرف ملک، بلکہ برطانوی ہند کی خدمت کرنے تیار ہے اور کچھ نہ کچھ خدمت انجام دیرہا ہے اس مملکت کے عہد گزشتہ کے بعض مخصوص خدوخال آج تمدن اور شائستگی کا لازمہ نظر آرہے ہیں۔

علم شائستگی کی کنجی ہے۔ جس قوم اور جس ملک کو یہ ہاتھ آجائے، تہذیب اور شائستگی کے تمام باب رفتہ رفتہ وا ہونے لگتے ہیں۔ اعلیٰ حضرت سلطان العلوم کی حکیمانہ نظر نے ملک کی اصلی ضرورت کو جانچ کر ایک ایسا عطیہ مرحمت کیا جس کا فیض نسلوں تک جاری رہے گا۔ موجودہ علمی اور تعلیمی ترقیوں کا اثر ملک کی فضا پر جن جن زاویوں سے پڑ رہا ہے، اس کی تفصیل ایک مستقل کتاب چاہتی ہے مختصر یہ کہ حیدرآباد میں جدید شائستگی کی کرن طلوع ہوچکی ہے، اور قدیم فضا بیدار ہوکر سرگرم عمل ہوگئی ہے زندگی کی یہ لہر جو شدت میں ہندوستان کے کسی دوسرے صوبے سے کم نہیں ہے، فرخندہ بنیاد کی رونق اور چہل پہل کا باعث بن رہی ہے۔ حیدرآباد کی علمی تاریخ کا یہ دور گزشتہ تمام دوروں کے مقابلے میں بہت زیادہ درخشاں اور بہت زیادہ اثر آفریں ہے۔"

خطبہ صدارت

ابو الخیر ابراہیم حسینی صدر انجمن اتحاد

صدر محترم، شفیق اساتذۂ عزیز برادرانِ جامعہ اور معزز حاضرین جلسہ!

میں برادران جامعہ کا ممنون ہوں کہ اُنھوں نے انجمن اتحاد کی صدارت کے لئے مجھ ناچیز کو منتخب فرماکر ایک ایسے ادارہ کی خدمت کا موقعہ عطا فرمایا، جس کے اراکین کے متعلق ہندوستان کی علمی دنیا کے ایک تجربہ کار فرد نے رائے قائم کی ہے کہ اگر اقلیم ہند میں "حیات انسانی کی تعمیر کا بہترین مسالہ" کہیں ہے تو ہمین است و ہمین است و ہمین است۔ آپ مجھے معاف فرمائیں اگر آپ اس وقت مجھے اپنی قسمت پر نازاں پائیں۔

سرزمین دکن کے مختلف اللسان اور مختلف المذہب عناصر کی شیرازہ بندی یعنی دکنی قومیت کی تخلیق کا واحد ذریعہ جامعہ عثمانیہ ہے؛ جس کا عملی ثبوت ہماری انجمن اتحاد ہے۔ پس یاد رہے کہ دکن کے عصر جدید کے علمبردار ہم ہی ہیں۔ اس اعزاز کی ذمہ داریاں بھی بہت وسیع اور سنگین ہیں؛ جن کی تکمیل کا ذریعہ انجمن اتحاد جیسی تربیت گاہ ہی ہوسکتی ہے۔

خدمت انجمن کے لیئے میرے رفقائے کار کا اور میرا کیا لائحہ عمل ہوگا، اُس کی تھوڑی سی جھلک ہمارے انتخابی عزم نامہ سے ظاہر ہو چکی ہے، جس کے اعادہ کی اب چنداں ضرورت نہیں۔ لائحہ عمل کی بقیہ تفصیلات کا ذکر کرنے کی بجائے میں مناسب سمجھتا ہوں کہ وہ عملی طور پر آپ کے آگے پیش کئے جائیں۔ آج جب کہ اس جلسہ میں محترم نائب امیر جامعہ اور شفیق اساتذہ بھی تشریف فرما ہیں، میری یہ خواہش ہے کہ چند ایسے اساسی مسائل پر برادران جامعہ کے جذبات و احساسات کی ترجمانی کروں جو فی الوقت اُن کے غور و فکر کا مرکز بنے ہوئے ہیں ـــــ مجھے قوی توقع ہے کہ ارباب جامعہ میری ان گزارشات پر شفقت کی نظر ڈالیں گے۔

یہ امر اب محتاج بحث نہیں رہا کہ ہمارا نظام تعلیم نظرثانی کا محتاج ہے؛ کیونکہ حکومت سرکار عالی نے تعلیمی کمیشن کا تقرر فرما کر اس اہم ضرورت کو محسوس فرما لیا ہے۔ اہل ملک کی نظریں بالعموم اور طالب علموں کی نظریں بالخصوص کمیشن کی سفارشات پر لگی ہوئی ہیں۔ سررشتہ تعلیمات اور جامعہ عثمانیہ کی عین خوش قسمتی ہے کہ اس نازک موقع پر تعلیمات کی صدر المہامی اور معین امیر جامعہ کی خدمت پر ایک ایسی ہستی فائز ہے جس کا اعلیٰ ترین نصب العین اور عزیز ترین تمنا سرزمین دکن کی علمی آبیاری ہے۔

پس حضرات شگون نیک ہے۔ اس موقعہ پر محترم نائب امیر جامعہ کی وسیع النظری سے توقع ہے کہ وہ مجھے اجازت دیں گے کہ میں آپ کے روبرو اُن توقعات کا اظہار کر دوں جو جامعہ عثمانیہ کے طالب علموں کی برادری نے کمیشن مذکور سے وابستہ کر رکھی ہیں۔

(ا) سب سے اہم مسئلہ ذریعۂ تعلیم کا ہے۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جامعہ عثمانیہ کے قیام سے حیدرآباد نے ہندوستان پر ایک احسان عظیم کیا ہے؛ کیونکہ ہندوستان کی قومی زبان، یعنی ہندوستانی کو ذریعۂ تعلیم قرار دے کر، اور اس زبان میں مختلف علوم کو منتقل کر کے، اور نیز جدید اصلاحات سے ہندوستانی ادب کو مرصع کر کے حیدرآباد نے اقلیم ہند کے ایک اہم ترین قومی مسئلہ کا کامیاب حل مہیا کر دیا ہے۔ اب ضرورت اس امر کی ہے کہ جامعی اور قبل جامعی نظام تعلیم میں ایک صحیح اور فطری ربط پیدا ہو، جس کی

واحد صورت یہ ہے کہ مدارسِ تحتانیہ، وسطانیہ اور فوقانیہ میں صرف ہندوستانی ہی ذریعۂ تعلیم رہے اور بس، جامعہ عثمانیہ ہندوستان کا کامیاب ترین تعلیمی ادارہ اُسی وقت بن سکتا ہے جب اُس کے جملہ (FEEDERS) فیڈرس اُسی عظیم الشان اصول کے حامل ہوں جس نے خود جامعہ کو ہندوستان میں ایک ممتاز حیثیت بخشی، یعنی ہندوستان کی قومی زبان کا ذریعۂ تعلیم قرار دیا جانا۔ مجھے اہل وطن سے توقع ہے کہ وہ ایک زبان ہوکر حکومت سے استدعا کریں گے کہ "ہندوستانی" زبان اس رفیع المرتبت ہندوستانی ریاست کے نظامِ تعلیم کی روح رواں قرار دی جائے۔ مجھے اس امر کے اظہار میں ذرہ برابر تامل نہیں کہ اہل ملک کی نظروں میں بالعموم اور عثمانئین کی نگاہوں میں بالخصوص تمام وہ تعلیمی ادارے جنھیں جامعہ عثمانیہ کی سرپرستی اور الحاق کا شرف حاصل نہ ہو، کھٹکتے رہیں گے۔

حضرات! ایک ایسے ملک میں جو نہ صرف سیاسی وحدت رکھتا ہے بلکہ تمدنی اور تاریخی بھی، نظامِ تعلیم کی رنگا رنگی سماجی انتشار کا باعث ہوسکتی ہے۔ دکنی قومیت کا ہر سچا علمبردار اس رنگا رنگی کے خلاف جتنا بھی احتجاج کرے، کم ہے۔ ہماری یہ تمنا ہے کہ ملک سرکار عالی کی ہر درس گاہ میں ہندوستانی ہی ذریعۂ تعلیم رہے، تاکہ جامعہ عثمانیہ کا مستقبل اور شاندار ہو اور دکن میں وہ توقعات پوری ہوں اور یہاں وہ روح سرایت کرے، جو جامعہ عثمانیہ کی تاسیس سے سارے ہندوستان میں پیدا ہوگئی ہے، اور جس کی تقلید ہندوستان کی دیگر جامعات کر رہی ہیں۔

(۲) ملک کی دوسری اہم ضرورت یہ ہے کہ سررشتۂ تعلیمات اور جامعہ عثمانیہ کے نصاب ہائے تعلیم میں تاریخ دکن اور بالخصوص تاریخ آصف جاہی، نیز جغرافیۂ دکن اور معاشیات دکن کو وہ اہمیت دی جائے جس کی یہ مستحق ہیں۔ یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ ہم دنیا کے ہر حصہ کی تاریخ و جغرافیہ اور معاشیات سے واقف کرادئے جاتے ہیں، لیکن اگر بے خبر ہیں تو اپنے ہی وطن کی تاریخ، جغرافیہ اور معاشیات سے۔ ان مضامین پر مستند اور مبسوط کتابیں تک تیار نہیں ہوئیں۔ یہ ایک اہم خدمت ہے جو فوری توجہ کی محتاج ہے۔

اسی ضمن میں یہ ذکر بے موقعہ نہ ہوگا کہ تعلیم یافتہ طبقہ کے لئے ملکی حالات، ضروریات اور امکانات سے

واقف ہو کر اربابِ اقتدار اور اہلِ ملک کے سامنے حالات کی صحیح ترجمانی اور ترقی کی امکانی صورتیں پیش کرنا اور خود اُس میں مصروف ہو جانا ضروری ہے۔ عثمانیین نے تعطیلات کے دوران میں ہندوستان کے مختلف قطعات کی طویل سیاحتوں کے ذریعہ واقفیت حاصل کرلی ہے اور اب وہ وقت آگیا ہے کہ اپنے ملک کے مقامات اور حالات سے واقف ہونے کی کوشش کریں۔ ہمارے ملک کے بہت سے ایسے قابلِ دید مقامات ہیں جن سے ہم میں سے اکثر ابھی ناواقف ہیں۔ ملک کے قدیم تاریخی مقامات کو دیکھنا اور وہاں کی معاشرت سے واقف ہونا ہمارے لئے نہایت ضروری ہے۔ چنانچہ اپنے پیش کردہ عزم نامہ میں ہم نے اندرونی سیاحتوں پر زور دیا ہے۔

تعلیمی کمیشن کی ہمدردانہ تحقیق اور تصفیہ کے محتاج تین اور مسائل ہیں جن کا اجمالی ذکر ضروری ہے۔

۱۔ تحدیدِ تعلیم کی عام شکایت۔

۲۔ امتحانات کی سختی۔

۳۔ نظامِ تعلیم میں ایسی ترمیم جو بے روزگاری کا حل مہیا کرنے میں مدد دے سکتی ہے۔

بے روزگاری کے سلسلہ میں انجمن اتحاد کے قدیم صدر صاحبان میں سے چند نے اربابِ اقتدار کو اس جانب متوجہ کیا تھا کہ تعلیم یافتہ طبقہ کو عموماً اور عثمانیین کو خصوصاً ملک کی سرکاری حیثیت سے خدمتگزاری اور یہاں کے معاشی ذرائع سے استفادہ کے خصوصی حقوق مہیا فرمائیں۔ یہ امر باعث مسرت ہے کہ اربابِ حل و عقد نے اس جانب اپنی توجہ مبذول فرمائی ہے۔ لیکن یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ عثمانیین کی جانب مزید توجہ کی درخواست کی جائے۔ اس لئے کہ یہی وہ ادارہ ہے جو ملکی ضروریات کے تحت تاسیس پایا ہے۔ اور اسی کے افراد ملک و ملت کی خدمت حقیقی جذبہ کے ساتھ کرسکتے ہیں۔

طلبائے جامعہ کو یہ سن کر خوشی ہوگی کہ عنقریب یونیورسٹی ٹریننگ کور کا انعقاد عمل میں آجائے گا طلبا کی جسمانی نشوونما اور اُن میں ضبط و تنظیم کی عسکری روح پھونکنے کے لئے یونیورسٹی ٹریننگ کور ایک مفید ذریعہ ثابت ہوگی۔ اُمید ہے کہ یہ جلد از جلد اپنا عملی کام شروع کردے گی۔

میرا خطبۂ صدارت نامکمل رہے گا اگر میں اس وقت عالیجناب کی توجہ ایک اہم ضرورت کی طرف مبذول نہ کراؤں۔ اس سے میری مراد برادران جامعہ کے لباس کی یکسانیت ہے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ مسئلہ ارباب حل و عقد کے بھی پیش نظر ہے۔ لیکن اگر عالیجناب اس میں اپنی خاص توجہ سے کام لیں اور جلد سے جلد احکامات نافذ فرمائیں جن کا برادران جامعہ ایک زمانہ سے انتظار کر رہے ہیں تو یکسانیت لباس کے باعث جشن سیمیں کے زمانہ میں ڈسپلن (Discipline) کا بہترین مظاہرہ ہو سکتا ہے۔

بالآخر میں ایک ضروری گزارش پر اس خطبہ کو ختم کرتا ہوں۔ وہ یہ کہ حضرت سلطان العلوم ظلہ کے عہد ہمایونی کے جشن سیمیں کے سلسلہ میں حاضرین سے درخواست ہے کہ وہ اپنی آراء اور تجاویز سے میری مدد فرمائیں۔ میں نے خود بھی اس مسئلہ پر کافی غور کیا ہے۔ لیکن اس غرض سے کہ ہمارا جشن سیمیں کا پروگرام واقعی ایک یادگار پروگرام ہو میں آپ حضرات سے دوبارہ درخواست کرتا ہوں کہ اس مسئلہ پر غور فرمائیں۔

اب میں کاروبار انجمن میں جناب نائب معین امیر جامعہ، اساتذہ صاحبان اور برادران جامعہ سے تعاون عمل کا خواستگار ہوتا ہوا اس دعا پر اپنے خطبہ کو ختم کرتا ہوں:

زندہ باد شاہِ عثمان

پائندہ باد جامعۂ عثمانیہ

تبصرے

"باز کے سو شعر" ۔ مرتبہ محمد واجد علی خاں جاوید

مطبوعہ شمس الاسلام پریس۔ چھتہ بازار۔ حیدرآباد دکن

یہ محمد تراب علی خاں صاحب باؔز شاگرد کیفیؔ مرحوم کے کلام کا انتخاب ہے۔ اگرچہ کسی شاعر کے منتخب کلام کو دیکھ کر اس کی شاعری کی نسبت کوئی مستقل رائے قایم کرنا اصولاً صحیح نہیں لیکن باؔز صاحب کے سو اشعار پڑھنے کے بعد اتنا ضرور کہا جاسکتا ہے کہ شاگرد نے استاد سے حاصل کئے ہوئے فیض سے کافی فائدہ اٹھایا ہے اور اپنی طبیعت کی فطرتی روانی سے اپنے جذبات کے اظہار میں پوری پوری مدد لی ہے۔ بہرحال یہ پاکٹ اڈیشن خوش باش حضرات کے اوقات فرصت کا ایک دلچسپ رفیق ہے کاشانہ باؔز بازار گھانسی سے واجبی قیمت پر مل سکتا ہے۔

مدیر

حیدر آباد دکن کی تعلیمی ترقی گذشتہ ربع صدی میں۔

(از۔ پروفیسر عبدالقادر صاحب سروری، ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی (عثمانیہ)

رائل کراؤن سائز۔ ۱۳۶ صفحات۔ دیدہ زیب لکھائی چھپائی۔ قیمت (عصہ)

ہندوستان کی علمی دنیا سروری صاحب کی اُردو خدمات سے بخوبی واقف ہے۔ "جدید اُردو شاعری" "دنیائے افسانہ" "دنیا کے شاہکار افسانے" اور ایسے ہی تحقیقی موضوعات پر آپ نے متعدد کتابیں تصنیف کی ہیں اور انکی انفرادی اہمیت سے کوئی شخص بھی انکار نہیں کرسکتا۔ زیر نظر نسخہ موصوف کی علمی جدوجہد کا تازہ ترین نتیجہ ہے، آپ نے اس مختصر سے رسالہ میں حیدر آباد کی تعلیمی تاریخ کا کوئی اہم باب فروگزاشت نہیں کیا۔ سلطنت عظمت مدار کے خدایان تعلیم کی ان تھک کوششیں، یہاں کے قدیم پاٹ شالوں اور درس گاہوں کی جامع روئداد عام تعلیم کی طرح اندازی، اور استحکام نئی نئی تحریکات پر غور وخوض اور ان کا اجراء اور دور عثمانی کی سب سے زیادہ نمایاں برکت یعنی جامعہ عثمانیہ کی غیر معمولی کامیابی پر نہایت تحقیقی شان سے روشنی ڈالی گئی ہے۔

حیدر آباد میں ایسی بارآور کوششیں مبارکباد کی مستحق ہیں۔

مرزا سرفراز علی

مصحف (ماہواری)

مدیر جناب شاکر نائطی۔ اوسط تقطیع۔ اچھی لکھائی چھپائی۔ اچھا کاغذ مقام اشاعت عمر آباد

چندہ سالانہ تین روپیہ ششماہی ایک روپیہ بارہ آنے۔

افسوس ہے کہ اُردو صوبہ مدراس کی سرزمین کو بہت کم راس آسکی، ہم اپنے مشاہدہ کی بناء پر کہہ سکتے ہیں کہ یہاں ہندوستان کی کسی زبان کا بھی تیا پرچار نہیں ہوتا۔ اہل مدراس نے انگریزی زبان کو معمولی

خط و کتابت اور علم بول چال کا ذریعہ بنا رکھا ہے، یہاں کی انگریزی بھی ایک دیسی شان لئے ہوئے ہوتی ہے مانگے تانگے کا لباس اور وہ بھی بے ڈھنگے پن سے پہنا جائے تو ظاہر ہے کہ جسم کی خاطر خواہ زیبائش نہیں ہو سکتی۔

بیسویں صدی ہندوستان میں "ہند لسانی" تحریک کا دور ہے ایسی مبارک اور اہم ترین تحریک باہمی میل جول اور یک جہتی کے بغیر ہرگز بار آور نہیں ہو سکیگی۔

ہمیں یہ معلوم کر کے بیحد خوشی ہوئی کہ عمر آباد کے نئے اور واحد ادبی صحیفہ "مصحف" کا ادارہ ایک پر وقت اور نصب العینی مسلک کا بیڑا اٹھا رہا ہے۔ قابل "مدیر" جناب شاکر نائطی نے اپنے مختصر اور مفید اداریہ میں اپنے ہاں کے ان رسائل کا ذکر کرتے ہوئے جو بہت کم عرصہ تک افق ادب پر چمک سکے اور صوبہ مدراس کو صحافت کی بزم میں شریک کرنے سے محروم کر گئے "مصحف کے" "استقلال حیات" کی تمنا کی ہے اور ہماری دلی کی خواہش بھی یہی ہے کہ یہ رسالہ بہت جلد استقامت اور معیاری حیثیت حاصل کر لے اس مقصد کے لئے لازم ہے کہ اردو کے اہل قلم حضرات اس کی حکمۂ علمی امداد کریں اور اہل ملک اس کی توسیع و اشاعت میں دلچسپی کے ساتھ حصہ لیں۔

ہمیں ہندوستان کے بہترین رباعی گو شاعر حضرت امجد حیدر آبادی بھی بزم مصحف میں جلوہ افروز نظر آ رہے ہیں۔ ان کا سرمدی رنگ انسانی روح میں ایک دلخوش کن تڑپ پیدا کر دیتا ہے۔ مولانا سید سلیمان ندوی اور مولوی حبیب خاں صاحب نے ایک ہی موضوع یعنی "اصلاح زبان اردو اور اردو کی تاریخ" پر الفاظ کے ہیر پھیر اور خیالات کی ہم آہنگی کے ساتھ روشنی ڈالی ہے۔

جناب رومان بنگلوری کی رباعیاں شگفتہ انداز بیان اور انوکھے "طرز تخاطب" کی حامل نظر آتی ہیں۔

مولوی نصیر الدین ہاشمی نے "والہ اور ان کی شاعری پر ایک تنقیدی مضمون قلمبند کیا ہے۔

مرزا سرفراز علی

فن انشاء پردازی

از ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی (لندن) پروفیسر ادبیات اردو

جامعۂ عثمانیہ، نفیس کاغذ، اوسط تقطیع، دیدہ زیب لکھائی چھپائی، قیمت ندارد، ملنے کا پتہ رفعت منزل، سوماجی گوڑہ۔ حیدرآباد دکن

قدرت کی جانب سے مختلف انسانوں میں خاص خاص خوبیاں ودیعت کی گئی ہیں لیکن وہ ان سے اس وقت تک کما حقہ فائدہ نہیں اٹھا سکتے جب تک کہ انھیں ان کا پورا احساس نہ ہو جائے۔

انگلستان کا مشہور انشا پرداز "جونز" اولین انسان کو ایک بغیر تراشے ہوئے ہیرے سے تشبیہ دیتا ہے، جو تربیت کے نازک اوزاروں کی مدد سے خوبصورت شکل میں تبدیل ہو جاتا ہے، اسی طرح ایک ہونہار انشا پرداز، اپنی سیرت کی اصلاح، خیالات کی صحت بخش پرورش، اور کائنات کا وسیع مطالعہ کئے بغیر حقیقی عظمت کا مالک نہیں بن سکتا۔

اردو کے نومشق ادیبوں کو ایسی رہنمائی کی سخت ضرورت ہے ہمارے ہاں کی بیشتر لڑکیاں اور لڑکے، انشا پردازی کے خبط میں مضحکہ خیز ذہنی عیاشی کا شکار ہو جاتے ہیں اور جب تک انھیں سیدھے راستے پر نہ لگایا جائے کوئی مفید کام انجام نہیں دے سکتے۔

پروفیسر زور صاحب کی یہ تصنیف اس بے راہ روی کا بہترین علاج ثابت ہوگی۔ یہ کتاب کوئی بیس یا اکیس ابواب پر مشتمل ہے اور ان کی تقسیم کچھ ایسے شگفتہ عنوانات اور خوش سلیقگی کے ساتھ کی گئی ہے کہ انسان اسے ایک مرتبہ شروع کرنے کے بعد ایک ہی نشست میں ختم کر دینے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ مصنف نے اپنی اس تصنیف میں اپنے غیر معمولی تجربے اور چھان بین کے ذریعے، انسانی نفسیات کے نہایت دلاویز نمونے پیش کئے ہیں۔

ابتدائی چند ابواب میں لکھنے کے محرکات، کسی مضمون کے ضبط تحریر میں آنے سے قبل کے مراحل اور موضوع کے انتخاب سے بحث کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ مصنف نے مختلف ادبی موضوعوں مثلاً ظرافت نگاری، موقتی مضامین اور افسانے، عورتیں اور انشا پردازی، بچوں کے لئے لکھنا وغیرہ سے متعلق ضروری اور عجیب

معلومات فراہم کئے ہیں۔

ہندوستان کے مزاحیہ نگار انشا پردازوں میں ظفر علی خاں، مہدی حسن افادی، عظمت اللہ خاں، خواجہ حسن نظامی اور رشید احمد صدیقی کے ساتھ ملا رموزی کو شامل نہ کرنا چاہئیے اور پطرس، آغا حیدر حسین اور فرحت اللہ بیگ جیسے اہل قلم حضرات کی صف میں ام۔ اسلم اور تمکین کاظمی کو لا بٹھانا اور بھی ستم ظریفی ہوگی۔

اس کتاب کے دو ابواب یعنی بچوں کے لئے لکھنا اور افسانہ لکھنا خاص طور پر مطالعہ کے قابل ہیں۔ ذیل میں نمونہ کے طور پر اول الذکر باب سے ایک اقتباس پیش کیا جاتا ہے۔

- "بچوں کے لئے لکھتے وقت نئے انشا پردازکی ایک عام غلطی یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے بڑے پن کو چھپا نہیں سکتا اور اس کا ایک ایک لفظ ظاہر کرتا ہے کہ کوئی بزرگ اپنے چھوٹے کے لئے لکھ رہا ہے، اس سے زیادہ کوئی چیز کم سن مطالعہ کرنے والے کو رنج نہیں پہنچاتی، وہ مساوات کا برتاؤ چاہتا ہے..........
اسی مصنف کی تحریریں بچوں میں زیادہ مقبولیت حاصل کرسکتی ہیں جو خود ایک بچہ بن کر اپنے ساتھی دوسرے بچوں کو قصے سناتا ہو..........

پروفیسر سید محی الدین صاحب قادری زورؔ کا اسلوب نہایت سلجھا ہوا اور دلنشین ہے، اس کا احساس مجھے اس وقت ہوا جب میں اقامت خانہ میں بیٹھا ہوا ان کی کتاب "فن انشا پردازی" پر تبصرہ کرنے کے لئے اس کا مطالعہ کر رہا تھا اور دریچہ کے اس جانب کلیہ فنون کی عمارت میں لگائے جانے والے پتھر تراشے جا رہے تھے۔ یہ کیفیتیں ایک دوسرے سے بالکل متضاد تھیں اور عام تجربے کے تحت سنگ تراش کی غیر شاعرانہ حرکتیں میری خاموش مشغولیت پر غالب آجاتیں اگر ان کا غیر معمولی ذوق ادب میری توجہ کو اپنے آپ میں جذب کر لیتا۔

مرزا سرفراز علی

ٹیگور اور ان کی شاعری

از جناب مخدوم محی الدین صاحب بی۔ اے (عثمانیہ) اوسط تقطیع۔ اوسط لکھائی چھپائی ۱۲۰ صفحات

مطبوعہ مطبع عہد آفریں قیمت عصہ ملنے کا پتہ: شعبہ اردو جامعہ عثمانیہ۔

مہارشی ٹیگور بین الاقوامی شہرت کے حامل ہیں۔ ایسی یگانۂ روزگار ہستیاں کسی قوم میں روز روز نہیں پیدا ہوتیں، بنگال اس انمول ہیرے پر جتنا بھی فخر کرے، حق بجانب ہے، ادب عالیہ میں ان کی جدت طرازیاں بنی دنیا تک یادگار رہیں گی اور لوگ ان کے جواہر پاروں کو پڑھ پڑھ کر اپنی روح کو تسکین دیا کریں گے۔

ملک کے تعلیمیافتہ اشخاص گو ان کی اکثر تصانیف سے واقف ہو چکے ہیں لیکن ہندوستان کے شاعرِ اعظم کی حیات پر ہندوستانی زبان میں کوئی تصنیف موجود نہیں ہے۔

جامعہ عثمانیہ کے "سلسلہ ادبیات" نے جس کے عمومی مدیر ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور ہیں اردو زبان اور ادب میں مختصر اور کارآمد کتابوں کے اضافہ کا بیڑا اٹھایا ہے، اس سلسلہ میں چند کتابیں تو منظر عام پر آچکی ہیں اور چند زیر طبع اور زیر تصنیف ہیں۔

مخدوم محی الدین صاحب کی یہ تصنیف اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ اس کتاب میں مہارشی رابندرا ناتھ ٹیگور کے حالات زندگی اور مختلف ادوار شاعری پر دلچسپ پیرایہ میں روشنی ڈالی گئی ہے قابل مصنف نے کتاب کی ابتدا میں بنگالی ادب کے احیاء اور ٹیگور کے بچپن اور ماحول کا ذکر کیا ہے۔ علم و فضل اور خداداد ذہنی قابلیتیں انھیں اپنی میراث میں ملی تھیں۔ راجہ رام موہن رائے کے بعد دوندرا ناتھ ہی ایک ایسے شخص تھے جنھوں نے بنگال میں ہندوستانیوں کی ڈوبتی ناؤ کو بچا لیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ لوگ مغربی علوم کی تحصیل اور مغربی تہذیب کے اتباع سے بیحد جی چراتے تھے۔

ایسے قابل باپ کا سایۂ عاطفت ٹیگور کی فطری ذکاوت کے لئے سونے پر سہاگا تھا، انھوں نے بہت جلد بنگالی ادب اور علوم متداولہ میں کافی دستگاہ حاصل کرلی اور آخر کو اپنے جنم بھوم کے لئے افتخار کا باعث ہوئے۔

اس کتاب میں ٹیگور کی شاعری کے پانچ دور قائم کئے گئے ہیں اور آخری باب میں ان کے پیام کا

خلاصہ پیش کرتے ہوئے بتلایا گیا ہے کہ ٹیگور عالمگیر برادری کے قیام پر کامل ایمان رکھتے ہیں۔

مخدوم محی الدین صاحب جامعہ عثمانیہ کے ہونہار شاعر ہیں اور انھوں نے اپنے اس مفوضہ فرض کو بوجوہ احسن انجام دیا ہے، اگرچہ کتاب میں (غالباً کاتب ہی کے سہو سے) چند ایک غلطیاں رہ گئی ہیں، اور ضرورت سے زیادہ اختصار کو کام میں لایا گیا ہے لیکن ہمیں مسرت ہے کہ انھوں نے اردو ادب میں ایک ایسی چیز کا اضافہ ضرور کر دیا ہے جو کسی طرح رائیگاں نہیں جا سکیگی۔ فقط

مرزا سرفراز علی

کلیہ کی خبریں

نائب معین امیر جامعہ کا خطبہ ۱۶ امرداد ۱۳۴۴ ف دن کے ایک بجے مولوی قاضی محمد حسین صاحب ام۔ اے (کنٹب) رینگلر، نگران کار نائب معین امیر جامعہ نے طلباء اور اساتذہ کو مخاطب فرمایا، تعطیلات گرما میں ممالک محروسہ سرکار عالی کی تعلیمی تفریح اور انجمن اساتذہ جامعہ عثمانیہ کی منعقدہ توسیعی تقاریر پر اظہار خوشنودی فرماتے ہوئے آپ نے کلیہ کے نو وارد طلباء کا خیر مقدم کیا۔ اسی دوران میں موصوف نے چند نصب العینی خیالات کا اظہار فرمایا اور کہا کہ صداقت کی سرگرمی اور طالب علمانہ جفاکشی فرزندان عثمانیہ کے لئے قابل اکتساب ہی نہیں بلکہ قابل پرستش بھی ہے۔ برطانوی جامعات میں جنوب کی بہ نسبت شمالی علمی اداروں کی درخشاں کامیابی کا راز یہی صفات حمیدہ ہیں۔

جامعہ کی عمارات جوں جوں پایۂ تکمیل کو پہنچتی جا رہی ہیں ہمارا مستقبل زیادہ خوش آئند اور زیادہ ہمت افزا ہوتا جا رہا ہے۔

اس سلسلہ میں ایک امر قابل اعتراض یہ ہے کہ ان عمارات کی تعمیر میں سرکار عالی کے علاوہ شہر کے

متمول طبقہ نے ہاتھ نہیں بٹایا اور غالباً یہی واقعہ پبلک دلچسپی کے فقدان کا باعث ہوگا، بخلاف اس کے دنیا کی اور جامعات میں ہم بہت کم اس قسم کی کمی محسوس کرتے ہیں۔

آخر میں آپ نے فرمایا کہ میں اپنے رفقائے کار میں صرف فرض شناسی ہی کا متوقع نہیں ہوں بلکہ اُس سرگرم انہماک کا بھی جو اہل علم کا امتیازی جوہر ہے۔

مولانا سید سلیمان ندوی جامعہ عثمانیہ میں

مولانا سلیمان ندوی، شبلی اکیڈمی کے نہایت ممتاز رکن اور ماہ نامہ ”معارف“ کے مدیر ہیں۔ اُن کی شخصیت قارئین مجلہ کے لئے محتاج تعارف نہیں ہے۔ ۵ شہریور ۱۳۴۹ف دن کے ساڑھے تین بجے انھوں نے یونیورسٹی اڈیسن ہال میں مولوی الیاس برنی صاحب ام۔ اے، ال ال، بی (علیگ) ناظم دارالترجمہ کے زیر صدارت ”ہماری ملکی زبان“ کے عنوان سے ایک بصیرت افروز خطبہ ارشاد فرمایا۔

ابتداء میں ارباب جامعہ کو جامعہ عثمانیہ کے ”دارالعلم سے مدینۃ العلم“ بن جانے پر مبارکباد دی اور فرمایا کہ ہندوستان کی ذہنی، سیاسی اور معاشی آزادی کا انحصار ”ہوم رول“ سے زیادہ ”ہوم لینگویج“ پر ہے اور توقع ہے کہ عثمانیہ یونیورسٹی اس واحد نظام ادب کی تعمیر میں ہندوستان کے تمام تعلیمی اداروں سے سبقت لیجائے گی۔

مولانا کے خیال میں ”ہندوستانی“ کے سوا کوئی اور لفظ ہندوستان کی عام زبان کے مفہوم کو حاوی نہیں ہوسکتا۔ اس کی وسعت، عمق اور ہمہ گیری بہت جلد اسے دنیا کی معتبر زبانوں میں شامل کر دے گی اس میں آگے بڑھنے اور پھلنے پھولنے کی غیر معمولی طاقت موجود ہے اردو انشاء پرداز کو غیر مانوس الفاظ کے استعمال سے جہاں تک ممکن ہوسکے پرہیز کرنا چاہیئے، افسوس ہے کہ لکھنؤ نے ہندی کے ٹھیٹ اور شیریں الفاظ کو ٹکسال سے نکال باہر کردیا، ورنہ اُن سے آج ہمیں اردو زبان کے جلد از جلد عام فہم بنانے میں بہت کچھ مدد ملتی۔ میٹھے اور رسیلے لفظوں کی جگہ عربی اور سنسکرت کی ہیبت ناک ترکیبیں اردو کے مزاج سے موافقت نہیں کرسکتیں۔

ہندی میں برسات کی ابتدائی بوندوں کو "ڈونگرے" کہتے ہیں اگر آپ اس لفظ کو نظر انداز کر کے اسی مفہوم کو "فصل برشگال کا اولیں قطرہ" جیسے بھاری بھرکم الفاظ میں ادا کریں تو آپ کا یہ عمل صرف یہی نا انصافی پر مبنی ہوگا کیونکہ اس سے زبان پر ایک قسم کا بوجھ پیدا ہو جاتا ہے جسے وہ برداشت نہیں کر سکتی۔

تقریر کے اختتام پر صدر جلسہ نے معزز مقرر نواب سر امین جنگ بہادر اور دوسرے حاضرین جلسہ کا شکریہ ادا کیا۔

انجمن اتحاد کی مصروفیتیں

گزشتہ گرمیوں میں انجمن اتحاد نے جنوبی ہند کی تعلیمی تفریح کا انتظام کیا تھا۔ اس مرتبہ مدراس، بنگلور، اوٹی، اور سیلون وغیرہ پروگرام میں شامل تھے۔

بنگلور میں اس پارٹی نے اپنے امیر جامعہ مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر اور میسور کے دیوان بہادر سر مرزا اسمٰعیل سے ملاقات اور تبادلۂ خیال کیا۔

ماتلے اور سیلون وغیرہ میں بھی اس جماعت کی مصروفیتیں کافی دلچسپ اور پیدا آور رہیں اور تقریباً ایک مہینے کے بعد واپسی عمل میں آئی۔

ممالک محروسہ کا تعلیمی سفر

اس کے علاوہ کلیہ کے چند اہل ذوق طلبہ نے گزشتہ گرمیوں میں ممالک محروسہ کے چند اضلاع کا ایک نیم سرکاری دورہ کیا۔

اس سفر کی اصلی غایت یہاں کی دیہی معاشی اور تاریخی RURAL, ECONOMIC & HISTORICAL معلومات کا حصول بتلائی گئی ہے، یہ جماعت ۲۹ر اپریل ۳۵ء کو بلدہ سے روانہ ہو کر اور نظام آباد، ناندیڑ (بلولی، اردھاپور) پربھنی، جالنہ (گولا پانگڑی) اورنگ آباد (اجنٹہ، ایلورہ، فردا پور، خلد آباد، دولت آباد۔ پٹن، ویجاپور) مومن آباد، بیدر، یادگیر، شاہ پور، شوراپور، میں مناسب عرصہ تک قیام کر کے ۸ر جون کو حیدر آباد واپس ہوئی۔

مرزا عبدالباسط بیگ اور محی الدین، صاحبان اس سفر کی تفصیلی رپورٹ مقامی اخبارات میں

شائع کرا چکے ہیں۔

انجمن کے سالانہ انتخابات

اس سال کے انتخابات میں غیر معمولی جوش اور دلچسپی نمایاں تھی۔ رائے دہی کے روز شعر شاعری اور دوستانہ مبارز طلبی کا بازار گرم تھا اور یہ ہنگامہ حسب ذیل نتائج پر ختم ہوا۔

صدر۔ ابوالخیر سید ابراہیم حسینی ...... بی۔ اے (عثمانیہ) متعلم ام۔ اے (ابتدائی)

معتمد۔ محمد داور حسین ...... بی۔ اے (عثمانیہ) متعلم ال ال بی (آخری)

خازن۔ آر۔ جی۔ نندا پورکر ...... بی۔ ایس۔ سی (عثمانیہ) متعلم ال ال بی (ابتدائی)

کتبخانہ دار۔ ابوالخیر ...... متعلم سال دوم

اراکین مجلس انتظامی:۔ سال ششم ۔ کریم اللہ

〃 پنجم ۔ ایشور چندر رودیا ساگر

〃 چہارم ۔ مرزا سرفراز علی

〃 سوم ۔ صاحبزادہ نجابت علی خاں

〃 دوم ۔ صاحبزادہ محمد علی خاں ...... میکش

〃 اول ۔ امجد علی کامل

ال ال بی (ابتدائی) ۔ محمد علی خاں

〃 〃 (آخری) ۔ زاہد علی

انجینیرنگ کالج:۔ بی۔ ئی سال سوم ۔ عبدالرشید

〃 〃 〃 دوم ۔ رنگا سوامی

〃 〃 〃 اول ۔ غلام عمر

نئی کابینہ کا جلسۂ کرسی نشینی

۲۵ ر شہریور ۱۳۴۴ ف پنجشنبہ، مولوی قاضی محمد حسین صاحب نگران کار نائب معین امیر جامعہ کے زیر صدارت انجمن اتحاد جامعہ عثمانیہ کا سالانہ جلسۂ کرسی نشینی منعقد کیا گیا تھا۔ غلام محمد خاں صاحب ام۔ اے (عثمانیہ) سابق صدر نے سالانہ رُوئداد سُنائی اور سابق معتمد بزم نے نئے ارکانِ کابینہ کا استقبال کیا۔ صدر، معتمد اور مجلس انتظامی کے دوسرے عہدہ داروں کو صدرِ جلسہ نے پھول پہنائے۔

موجودہ صدر اور معتمد نے اپنی جوابی تقریروں میں اپنے پیش کردہ عزم نامے MANIFESTO کو لفظاً لفظاً پورا کرنے اور وہ سب کچھ فرائض انجام دینے کا وعدہ کیا جو یونیورسٹی یونین اور طلبا کے مفاد پر مبنی ہوں گے۔

مولوی قاضی محمد حسین صاحب نے قرآن شریف کی ایک آیۃ کا حوالہ دیتے ہوئے فرمایا کہ انسان کو وہی بات کرنی چاہیے جو احسن ہو۔" امتحانات کے نتائج اور یونیورسٹی کاؤنسل کی تجاویز پر طلباء اور بیرونی اشخاص کی چہ می گوئیاں نہایت غیر مستحسن ہیں۔ اربابِ مقتدر نے جامعہ کے نتائج کا جو معیار قائم کیا ہے، اُس کے بغیر ہم اپنے موجودہ وقار کو ہرگز برقرار نہیں رکھ سکتے۔

میں اپنے آپ میں نپولینی نفرتِ الفاظ NAPOLEONIC HATRED OF WORDS پاتا ہوں، مجھے اپنی روح انگریزی کے دو حرفی حسین لفظ یعنی " ڈی، او" Do" میں آسودہ نظر آتی ہے۔

انتقال

احمد محسن صاحب متعلم سال چہارم اور مسٹر شاوک جی متعلم سال اول کی ناگہانی جدائی کلیہ کے اساتذہ اور طلبا کے لئے ایک روح فرسا صدمہ تھی۔ ان کے انتقال پر انجمن اتحاد نے دو تعزیتی جلسے منعقد کیئے اور ان کے پسماندگان کے ہاں جامعہ کی جانب سے ہمدردی کی تحریریں روانہ کی گئیں۔

یورپی وظیفہ پر انگلستان کو روانگی

کلیہ کے ہونہار فرزند عزیز احمد صاحب کو جنھوں نے پیوستہ سال بی۔ اے کے امتحان میں امتیاز حاصل کیا تھا انگریزی ادب میں

بی۔ اے (آنرس) کی ڈگری حاصل کرنے کے لئے حکومت سرکار عالی نے یورپی وظیفہ عطا کیا ہے۔

موصوف ۲۴؍ مہر ۱۳۴۴ف ہفتہ کی شام کو حیدرآباد سے روانہ ہوئے ہیں ہمیں توقع ہے کہ آپ جامعہ عثمانیہ کی قائم کردہ روایات کو اقصائے مغرب میں بھی پیش نظر رکھیں گے۔

مسٹر مانکٹن مشیر وفاقی جامعہ عثمانیہ میں

مسٹر مانکٹن کے۔ سی' مشیر وفاقی حکومت نظام نے ۲۴؍ مہر ۱۳۴۴ف دوشنبہ کو دن کے دو بجے سے تقریباً ساڑھے پانچ بجے تک جامعہ کے عہدہ داروں کی رہبری میں کلیہ کے مختلف شعبہ جات رجسٹریشن آفس اور اقامت خانوں کا معائنہ کیا۔

مرزا سرفراز علی
یونیورسٹی ٹاؤن
ستمبر ۳۵ء

to its Master.' Again the tea was ready before time, and Mumtaz eagerly awaiting Fareed. No sooner had our hero stepped in than she rushed to him saying: 'Congratulations to you, Fareed dear; our "Hag" won.'

'Is that so? How much?'

'Two thousand six hundred rupees; and I will give you eight hundred out of my own savings; that will make about 3400, quite enough for a new Austin Twelve—I believe.' 'Was not that a good choice of mine?' 'Yes, you are awfully clever, you know.'

K. MOINUDDIN SIDDIQI,
B. A. Senior.

PRINTED AND PUBLISHED BY W. H. WARREN AT THE DIOCESAN PRESS, MADRAS—1935.C4505

'We had better go on and try some place.' Zameer was speaking: 'Shall I drive?' 'No, thanks. I will keep on. There is no use changing now. We shall arrive somewhere soon.' 'I say, this storm is going to last for ever. It is bent on keeping us out of the way. What do you think, Mr. Zameer?' enquired Mumtaz, and added: 'We can't reach home to-night—I suppose.' 'Home!' Fareed laughed 'Nor half way either. We shall be lucky if we get anywhere out of this.' Nazeer started the engine again. The car roared forward in the darkness. They were benumbed and wet to the skin. They were sitting crazily behind two lamps that showed nothing but a streaming track and the flash of the rain. 'Lights! look, Nazeer, lights!' Mumtaz shouted: 'Pull in there.'

It was a small cottage or rather a deserted 'khanka'. 'Tat—tat—tat—' 'Can you put us up for a night?' Zameer shouted. But there was no reply. However after ten minutes the door was opened. The huge figure of a man appeared with full round beard and matted hair, with an earthen pipe in one hand and an old lamp in the other. Fareed addressed him after a minute's pause: 'We have come to ask you for shelter. We have lost our way and now we are absolutely cut off. We can't go any further.'

The man surveyed all the four from top to toe, and afterwards very reluctantly showed them in. Needless to say it was quite a humble place, uncomfortable for people like our friends, yet they found it better than the car. On the following morning they found that there was only a gallon and a quarter left in the tank: the car had consumed a gallon every twelve miles. However, they added four gallons of kerosene oil to the remaining petrol and at about seven were on their way homeward.

The old car proved quite a white elephant for Fareed. He realized his mistake. It was Mumtaz's victory over his prudence. For the future he had no ground to object to her for spending much over her requirements. On the occasion of the Silver Jubilee the old 'Hag' went as one of the competitors in a Motor Parade. To the surprise of all, especially Mumtaz—who hated it most—it won the prize under the name and style of 'Still faithful

Fareed said: 'These misfires are very necessary. They simply show that the pistons are working in harmony.'

'Oh, hang your pistons,' Nazeer replied, while Zameer assured them that it was a disease of a car. 'The charged accumulator is broken, or loose wires and water in the carburettor are responsible for the misfires. Is it not so, Nazeer?'

'Yes, besides what you said short crcuits anywhere in the wires can also be responsible for it.'

By this time they had covered about forty miles. They stopped at a farm, took a meal and waited for about two hours. This time they had not even gone a mile when one of the back tyres was down. Luckily they had a spare one and soon got it changed. Within half an hour they were again on their way.

Fareed was again asking: 'Nazeer, how is it that this car knocks so much?' 'The knocking of the car may be due to ignition being advanced too much, worn bearings, want of lubrication or when the flywheel is loose. But sometimes the—Oh, heavens! got a burst!' 'You don't say so' said Fareed. 'But we have no spare tyre.' The car was stopped.

They wondered what to do. Zameer suggested to fill the tyre with grass. Finding no alternative all the three men took to pulling grass, while Mumtaz lighted the stove and prepared fine tea for them. This splendid task took almost two hours. When they started again the sun was setting. Mumtaz suggested to return. But Nazeer wanted to proceed further, to see if they could reach some village and get a tyre and a tube. But suddenly they were caught in a heavy storm. The downpour and the noise of the engine were almost deafening. Nazeer stopped the car and leaned back, free for a moment from the task of steering through the roaring darkness. He was the coldest and the wettest of the four.

'It is simply idiotic going on like this. Where are we?' enquired Zameer. 'I don't exactly know.' 'It is hopeless,' Mumtaz was calmly condemning the situation. 'What is the time?' There was no light on the dashboard, so Fareed struck a match and held it near the clock. 'Half past nine.'

'Oh! hang your late model! Believe me, the outward show has nothing to do with the quality. This very car that you see once cost over five thousand, but I got it for only 600. Isn't it a good bargain?'

'No, I hate such bargains. I would rather pay more for my things and get good service out of them. Sometimes prudence like that of yours proves very harmful in the long run.'

'But, see how roomy it is! It will be quite fit for us and our present two and expected ones to take to your mother's home. Won't it?'

'But who will drive this Hag? I won't allow you to sit at the wheel.'

'Mumtaz, you see, it is quite easy to drive a car. I can very well able do it.'

'I tell you, you can't. This one does not suit you. You should have a driver.'

'But it will cost you 25 extra a month.' 'Well, you are to be believed for that.'

The next day they went on a pleasure trip. Fareed had invited Zameer and Nazeer his cousins. The latter considered himself to be an expert driver and so was at the wheel, Fareed by his side and Mumtaz and Zameer in the back seat, while the young ones were left at home with their ayah. Fareed was a very inquisitive man. He was eager to learn everything about the car as quickly as possible; he was watching very carefully everything that Nazeer was doing. He found that the car took very long to start, and asked: 'How is it, Nazeer, that it takes you long to start this car while most of them require only a single kick?'

'There must be something wrong with it. Generally it is due to petrol not reaching the carburettor. Sometimes the carburettor is not flooded or too much flooded. If the air inlet over the carburettor is open, or if the sparking is too much advanced, the engine starts badly.'

Mumtaz did not like the misfires of the engine. Every time there was a misfire she started. At last she declared: 'I don't like such explosions, they upset me.'

you know and you will find from the metre that it has not yet done even three thousand miles.'

Just then there came a roaring noise and Naseer shouted: 'There! your car is ready: look how nicely the engine sounds.' They came to the car. Referring to the 'tak—khat—tak' of the engine Fareed asked: 'Is there anything wrong with it?' 'Oh, no, it is a speciality with this car. It shows the harmony of the pistons, see how nicely they work. Come in, I will give you a trial run.'

'But is that the one you had for a thousand? I cannot pay you more than 600 if it works satisfactorily.'

'Of course,' replied Naseer. 'But you must not expect a lot from it at first. When once it starts, it will keep up and you will be satisfied with what it can do.'

A few moments later they drove out of the garage and when they were out of the city Fareed took the wheel while Narain told him how to drive, and what to do in case of emergency. As a matter of fact Fareed knew nothing about the technique of a car. His wife's suggestion for a car made him feel the necessity for it. The only thing he wished at the moment was to be himself at the wheel and his wife by his side on a pleasure drive. Thus without taking much care he bought the first available car—a car whose life was exhausted and being so venerable was more fit for some corner in a museum.

No sooner had Fareed entered his compound than his boy servant Rajiga ran to Mumtaz and burst out: 'Begum Sahib, Sarkar has brought a car—a big one!'

'Has he, but what does it look like?'

'Not—er—er—but—' By this, Mumtaz was out in the verandah. The very look of the car disappointed her. She could not have imagined that her husband would go in for such a kind as that.

Fareed came to her. 'Mumtaz, have you seen the car I brought for you?' 'Yes. But how on earth could you choose such an old Hag?' She added: 'I told you to get a small one of a later model.'

it, Fareed; consider your health.' He tried to explain the difficulties in keeping a car, but she would not listen. 'It would not cost much, a Baby Austin or a Fiat will make forty to forty-five miles to a gallon and you can drive it yourself. You are awfully CLEVER you know.'

It was the first time since they were married that she had referred to his cleverness and—what can a fellow do? The result was that that very evening he called on Naseer—a garage-owner and told him what he wanted. Naseer smothered his astonishment, looking squarely: 'So you want a car, do you, Mr. Fareed? What sort of a one? There is a New Opal over there, only Rs. 3,333/- or there is a Hilm——'. 'Mr. Naseer,' Fareed said firmly: 'I want a cheap car, a second-hand car, an old car. Something the wife and I can stroll about in—something for about a thousand.'

Naseer pondered: 'H'm! about one thousand rupees you said, didn't you, Mr. Fareed?' Fareed nodded. Naseer's face brightened as an idea struck him. 'I've just the thing you want.' He went to the door of his office: 'Narain, clean that "Mother." I want to show it to Mr. Fareed, be quick now.' He added 'Perhaps you would like to sit down while Narain gets it ready.'

Being anxious to see the car however he went to where the mechanic was trying in vain to clean a huge box-like thing, and asked whether it was the same that Naseer was speaking about. Presently Naseer came behind him, touching his arm: 'Please come into the office,' he said anxiously. 'That car,' he remarked, 'is a marvel. It is a very strong one; though not attractive, the body is roomy and comfortable. It was made for people to see the country and not for those who scoot around like mad.'

'What is the candle-power?' Fareed asked. 'Well, it is supposed to be eight.' 'And the Age?' Naseer leaned forward, laid his hand on his arm and said: 'Do not worry about the age of a car like this. To tell you the truth it was manufactured twenty-six years ago. But when I bought it I had to give above five thousand. That car is exactly a Slow Coach

THE HAG

FAREED was always afraid of his wife Mumtaz whenever she was too obliging. Because there always came after it some sort of request,—for a silken sari, if not ornaments. Naturally he could not avoid her. Whenever he gazed at her a moment, she suddenly looked down, while the most beautiful transparent pink flushed her soft white cheeks, turning her almost into a tender girl. The change used to be so sudden that it always startled him, leaving no alternative but to grant her request, to beg, borrow or steal, but to do whatever she asked.

One evening he was back at home after the hard toil of the day, surprised to see the tea was ready for him and his wife eagerly waiting. He had a hurried wash and sank in a chair at the table.

'Come along Mumtaz, join me.' 'Oh, thanks, you finish first,' and afterwards she sat on the arm of his chair and began stroking his hair. The white lids with their heavy lashes began to irritate him. Yes, she had certainly a mouth worth looking at again. But Fareed swung his eyes away. He wondered if she had not any clothes to wear or had received some invitation to attend a marriage ceremony, and thus wanted a new necklace or bracelets. He prepared himself to let her know that he could not buy anything she wanted at least for another two months. She understood him and said, patting his hand: 'I do not want anything for myself. I'm thinking of you.' She went on: 'I think you work too hard . . . and this bicycle of yours is almost destroying your health. You are looking quite pale and ill.'

It was the first time that Fareed realized his weakness. But he could not possibly help it. Not understanding why his wife mentioned his bicycle, he asked: 'So you want me to sell my bicycle? but it will not fetch more than twenty rupees.'

'Oh! no, dear, you ought to buy a car, only a small one,' she added quickly as he took a deep breath. 'Do please think about

I will remember thee through everything,
In indigence or wealth, when old, or when
The happy memories of youth upspring
Before the mind's clear eyes in years to be.

I may be tossed about upon the waves,
I may with surf and spray, with foam and flow
Be one, or finally be borne adrift.
I may rise high, to grandeur, and may live
Amidst renowned and immortal men.

Great honour may be mine, or yet I may,
Unknown even to my homeland drift away,
Leaving no record of my quiet life.

Yet shall I cherish thy sweet memory,
Content with what is mine of time and fortune,
Nor ever forget thy dear, beloved fields.

MIRZA ABBAS ALI KHAN,
Junior B.A. Class.

OSMANIA

OSMANIA! Can I forget thy fields?
Sweet mother, let me die upon thy lap ;
Let me have more of thy devoted love;
Thy tender arms, thy sweet endearing looks
Caress my tired body, my tired soul.

Oft have I watched all night, through silent hours,
Thy heavenly body change so many attires,—
Now blue in moonlight, blue-black under stars,
Then black, when a strange light plays secretly,
Together with the pale, awakened dawn.
Upon thy dewy grounds, on moonlit nights,
I have roamed for hours, breathing the keen air
That swiftly blows across thy high abode.

For thy dear sake I left my friends of youth :
For thy dear sake, I left all joy. Nay, more,
For thy dear sake I left my beloved home.

On a high rock, communing, through those hours
When day to evening, dusk to nightfall turns,
With the last sunbeams' golden light that fades
To solemn darkness on thy holy brows,
Then I, with starting tears, behold a vision
That shall be mine for ever.

Nourisher of my busy happiness,
Press me to thy dear bosom, closer still,
And suffer not thy son to go from thee.

I am become a part of all thy being ;
Thy plains I watch, thy rugged solitude
Change colour, brighten, darken, blush again,
Thy walls arising from the ancient rocks
Into the silence of the summer air.

luxuries of the palace desired to reside there, but it was impossible for him to be allowed to live among the ladies. So he pretended blindness and was permitted to live in the harem also.

One day he asked a maidservant to bring some thing he had left in a room. The servant said that she had no time to do so and went away. Soon another servant came and our poet who had grown lazy in such a luxurious home, asked the servant to bring him a basin of water. The servant wanted to excuse herself by saying that there was no basin in the room and that she would bring one from another apartment. The poet however retorted, saying: 'Bring it, there is one in the room, can't you see it?' In his anxiety to get the thing done, he forgot about his blindness and opened his eyes. The servant at once informed the queen of this who had him blinded and banished him from the palace for ever.

It will be seen that the great poet was the master of his own destiny. Blindness was incurred by his own actions. How good it would have been, if he had not desired to live in the harem!

Once realise that you are the masters of your own destiny and how happy you will feel! There is no longer any need to feel miserable. You have made your circumstances difficult and different. Realise your mastery, do not feel yourself to be a slave of your surroundings; realise this truth, and then whatever be your circumstances, whether the body is put into jail, or crushed under the heels of somebody, remember 'I am He, I am my master, I am my king, the master of my destiny'.—If you feel so and realise the truth in the practical life, you are Happiness, you are Joy, you are Heaven and all you will.
Realise:—

'Can I be doubt or sorrow-stricken
No, I am verily all causation,
All time is now, all distance here,
All problems solved, solutions clear.'
Farewell.

BABU NEEL KETU,
I Year B.

bring about the end—to reach the goal earnest effort is necessary. In most cases even the wish is not there; ambition itself does not soar high.

Here is a servant attending on a rich Marwari of Hyderabad and getting only 8 As. a day, he never in his dreams aspires to be like his master, with a round belly, rolling in a soft gaddi, in his room full of wealth. All that he may wish is to get an income of a rupee or two per day. Never does the idea enter his mind that he should become an opulent Marwari.

Now look at the matter from another standpoint. People mostly fail because they do not adjust their desires to their circumstances, and do not try to be masters of them. Thus they are led into difficulty and anxiety.

Here is a man, who chooses the profession of a thief. In his early days he becomes a rich man, but in the end what is the result? One day he is detected and arrested, and has to spend a portion of his life in a dark dungeon. Thus he alone is the master of his destiny. He could have tried to crush his bad desires and escape the fall into the dark pit that was before him.

When people desire anything they rarely think of the consequences, and never for a moment of the direction in which they will be led, so that in the end when they actually succeed in getting what they were wishing for they are disappointed. So it is that we have to blame ourselves for the misery thus brought on ourselves.

Long, long ago in the mists of antiquity there lived a prince. In his court was a great poet, who used to amuse the king with his poems and interesting tales. One night the king was entertained by the poet late into the night. The queen inquired of her husband why he had been kept up so late. The king told her of the poet. She also became curious and wanted to see him. Well, the next day the poet was brought before her. You know the ladies of India do not generally mix much with men. They see but their husbands, who are holy, pure and noble. They observe purdah. So the poet was given a seat outside the harem. He then recited his poem in such a beautiful manner that the queen and her friends were greatly pleased. The poet seeing the

MAN, THE MASTER OF HIS DESTINY

IT is a truism that a man can to a very large extent change his circumstances and surroundings. He can control them, can rise above them and thus make himself and others happy. From the poorest boy he can make himself the richest man, as so many have done. Paupers have succeeded in raising themselves to positions of renown and honour in this world. Men who were born in very humble circumstances have succeeded in reaching high station. Take the case of Napoleon; think of Shakespeare; meditate over the life of Mustafa Kemal, and the truth of the above theory will become self-evident.

Mustafa was the son of a very poor father, who lived by trading in timber. In his boyhood his father died, leaving him and his mother in a most miserable condition. They were penniless and had to struggle hard to maintain themselves. Kemal's mother took shelter under her brother's roof, and her son who was brought up in such miserable and disheartening circumstances now presides over the destinies of Turkey.

People may say that it was his fate to become a dictator; but my reply to them is, that in order to do so, he had to fight against the rough waves of the politics of Turkey. Many, like Enver, attempted this, but failed because of defective methods. Mustafa succeeded as he was the appropriate and most worthy man for the position and, moreover, he used proper methods.

If you are born blind or poor it is evidently because your doings in a previous life were sinful. Even confirmed fatalists have to admit past deeds and calculate the fate and destiny which are their result.

Here is another question before us. If we are the masters of our own destiny, none of us ever desires to be poor. How is it then we are born poor? All of us desire to be born rich, yet most of us are born in extreme poverty. For this we are to look at matters in their proper light, and to study them earnestly and thoroughly. Look at the facts from all sides. Mere desire cannot

There is murder, treachery, conspiracy and mutiny. I am involved in heart-wrecking difficulties. To none but mishap and misfortune do I look. At such a time I may pray.

There are many more chances of offering prayers; in despair, in pleasure, in examination (of any kind) I may pray.

Yet in spite of all these chances, there may occur many others about which I, as everyone else, know little. Prayer is indeed a practice that comforts us when we lose all hope of other consolation.

MOHAMMAD MAHMOOD HUSSAIN,
Junior B.A.

President of Fools

They called him President of Fools, but he
Nor spoke nor stopped, but walked on steadily.
Still they followed jeering with mockery.
'Yes; I'm the President of fools around me.'

A Scene in Early Spring

The mountains and forests outside the town
Were clad in vernal glory.
The babbling streamlet, full of childish pride,
'How happy I am! How happy I am!' it cried.

The very shrubs, in fresh green garments clothed;
Looked happier than ever.
The flowers seemed to laugh to the passing breeze
As children tossing in their mother's arms.

'Is not life happy?' the playful winds were asking
The proud old trees that nodded answeringly.
The world was whispering love and hope to the ear,
Nor any sorrow there, nor any fear.

SHESH RAO,
Junior Intermediate.

PRAYER

PRAYER! What solemn meaning lies in that word. See a man praying: what a venerable awe dominates him. I have seen many a man praying, though in different ways, yet the act affected me in the same manner.

I have seen a Hindu kneeling before his stony Idol, decorated with jewels. Marble steps, then high pillars of Roman style, long and narrow halls and then at the end was the Idol radiant under the dark ceiling of that temple, marked with the hands of antiquity. In mere murmuring breath he was praying; the small brass bell was slowly chiming and high above his head stood the Idol, gazing at him with his glittering diamond eyes. What a scene! Venerable indeed.

I have seen Christians kneeling before the altar in a high vaulted cathedral; Muslims, in mosques of high minarets, the crescents of which shine in the first rays of the sun.

All of these scenes struck me with the same awe, as all who were praying were in unison with God, because the God in man is one with God when man is in God.

I too pray, though not often, yet the place where I pray is not a fixed one. It is no shrine, no temple, no church, no mosque. I pray anywhere, when I feel inclined, and at any time that suits the emotion which makes me kneel before the One, invisible Supreme.

It may be when on moonlight nights I sit on grassy hills. Full-faced the moon shines in the dark-blue sky beneath the dim stars. Some tiny bulbul breaks the silence of the night by his melodious carols. Small rivulets falling from the green rivage sound as silver chiming bells. The still water of the lake shivers at every gust of chilling wind. At such a time I sit silent, my eyes stare at the moon, my tongue does not move, but my heart prays to Him.

lines in the grating. This method of investigating the property of X-rays, marked an epoch in the world of science. This method shows the internal structure of the crystal, not the shape of the crystal, but the manner in which its atoms are arranged. The discovery of Dr. Laue is a great triumph in this matter. But the diffraction problem in this case is not so simple as it is in common diffraction-grating, because the arrangement of the atoms extends over three dimensions instead of one as in the plane grating. He showed that when a pencil of X-rays was made to traverse a crystal, diffraction pencils would be formed in a regular pattern according to certain laws he formulated. He attacked this phenomenon from the mathematical side also, and succeeded in giving mathematical proofs and formulas. This experiment was best carried out by Messrs. Friedrich and Knipping in the spring of 1912, and was a brilliant success.

The experiment proving that cathode rays impinging on anticathode give rise to X-rays, and these X-rays, when they bombard matter of any kind, give rise to cathode rays, i.e., swiftly moving electrons, was strong evidence against the similarity of X-rays and light.

These swiftly moving electrons are named secondary electrons. It is found that the speed of the secondary electrons is the same as that of the primary electrons (X-rays). This is so no matter what the intensity of the X-rays may be; no matter what the nature of the material is, from which the secondary electrons seem to spring.

Thus there are different views concerning the real nature of X-rays. Sometimes we have to regard them as similar to the waves of light and sometimes of ether pulsations and swiftly moving electrons.

M. KARIMULLAH,
M. Sc. (Final).

most sensitive diffraction-grating, an instrument used to investigate diffraction-phenomena. E. Marx of Leipzig devoted great skill to measuring the velocity of X-rays. He overcame many experimental difficulties and asserted the equality of the velocity of light with the velocity of X-rays. But his experiments were not performed with such precautions as are necessary for confirmation, therefore his work did not lead to universal conviction. Later on, Barkla showed their similarity with light and proved this by his experiment of the polarisation of X-rays. Schuster, Wiechert, Stolas and J. J. Thomson afterwards proved that X-rays are electromagnetic waves.

As X-rays are similar to rays of light, the question naturally arises whether they are diffracted in the same way as light. Diffraction phenomena are often investigated by the use of diffraction-grating and spectrometer. Diffraction-grating usually is a plain plate of glass on which thousands of lines are scratched. Each of these lines acts as a single source of light and the diffraction takes place from every line, producing a spectrum characteristic of the wave length of the light end. The essential use of the grating is the absolute measurement of the wave length. The spacing of the lines is usually of the same order as the wave length to be measured. Sodium light which has a wave length of 5890 -8 cms. is diffracted through 24° by a grating which has 7000 lines to a centimeter.

When X-rays are examined by diffraction-grating, no diffraction occurs, showing that it differs from light. It is shown above that, to measure the wave length of the sodium line, we have to use a grating of 7000 lines per cm. The X-ray has a wave length a thousand times shorter than that of the sodium line, and to make a grating of this order is unthinkable, for the spacing would have to be of the order of the distances between the molecules of a solid.

But Dr. Laue of University of Zurich showed that the X-ray can also be diffracted by a grating in the same way as the ray of light, but the grating in this case is not that which is used for ordinary light. He used as a grating for the analysis of X-rays the molecules of crystals. These molecules act for the

THE NATURE OF X-RAYS

AT low pressures, when an electric current passes between two electrodes inside a glass tube, many interesting phenomena are seen. When the pressure of the gas inside the tube becomes very low, the glasses become phosphorescent, the colour being changeable according to the material of the gas used. In this condition, the negatively changed particles, called cathode-rays, proceed from the cathode towards the anode or anti-cathode. When these negatively changed particles bombard the walls of the tube or a material placed between their path, X-rays are emitted. The nature of these rays is yet a matter of conjecture.

The X-rays are distinguished by their characteristic properties. They differ from cathode rays in that they are not deflected by an electric or a magnetic field, whereas the cathode rays are. They ionise a gas and send an electric current through it. They can penetrate several materials of low density (this property has been used in surgery—the rays penetrate skin more easily than bone). They excite fluorescence in many substances.

The discovery of X-rays has an interesting story behind it. Röntgen while experimenting on the discharge of electricity through gases, found that a photographic plate lying near the apparatus was affected. He could not account for this, and he attributed the result to some unknown form of radiation he called X-ray radiation. It is now considered that X-rays are ether pulses which originate at a solid substance, when it is struck by cathode rays.

Ever since the discovery by Röntgen, the nature of X-rays has been the subject of keenest investigation. In many respects they resemble light. They cast shadows placed in their path; they travel in straight lines, and have many properties similar to those of light. In other respects they differ from light. Lenses and mirrors do not affect them. They are not diffracted by the

LINES WRITTEN ON A GARDEN SEAT

IF thou sit here to view this pleasant garden place,
Think thus.—At last will come a frost and all these flowers deface.
But if thou sit at ease to rest thy weary bones,
Remember death brings final rest to all our grievous groans;
So whether for delight or here thou sit for ease,
Think still upon the latter day: so shall thou God best please.

GEORGE GASCOIGNE

ON SOME LINES BY GEORGE GASCOIGNE

I THINK it is not right to say such dismal things,
Especially about a place where many a sweet bird sings.
I'm sure God does not wish that we should think of death
When He has given us life to live and joy at every breath.

It's true, of course, that frost will put the flowers to sleep,
But that's no reason why a man should grieve or groan or weep.
So if you find a garden of loveliness and light,
Be thankful first and thankful last, and say, with all your might:

Since God has shown what He can do with earth and sun and rain,
I too will take some common things, and with the body and brain
He gave to me, I'll try to see and show the deathless beauty
When all our thought is sympathy and all our rest is duty.

E. E. SPEIGHT

essay and sometimes my friend's name. I bitterly hate propaganda.

'Well! Excuse me. I have wasted a lot of your time; I assure you that you are the only person that can be my most sincere friend; all right, good-bye! Hope to see you very soon again (but this poor fellow does not dare to see him any more); and please don't forget to keep all these matters strictly confidential.' As soon as the victim comes out of his room he narrates the whole plot of the drama (rather tragedy) to every one of his acquaintances and when in the college Mr. Display hears the full report of his secret 'tea party'. He uses pretty strong words without addressing anybody.

Mr. Display is a perfect master in making enemies of the most sensible persons.

SIKANDER ALI WAJD, B.A. (OSMANIA)

ANOTHER KIND OF COLLECTOR

Very often when members of this or that archæological society came to examine his collection, some nosey old thing in whiskers would struggle to his feet.

'Gentlemen,' he would burble into his beard, 'I am sure we have all enjoyed Mr. Featherby's most able description of his valuable finds. But interesting though his conjectures undoubtedly are, from many of his conclusions I must beg to differ in toto.'

Then the fat would be in the fire. Barely able to restrain himself until the pestilential old pantaloon had said his say, the curator would pounce upon him, pulverise him, disembowel him, turn him inside out and upside down, now shaking him as a dog a rat, now gulping at him greedily as a pike gobbling up a gudgeon, until there was nothing left of the erstwhile antiquary but his beard and his boots and the palms of his hands.

CHARLES HODGES

When a student comes in contact with him for the first time, Mr. Display tries to make friends with him and behaves with him very politely, and even treats him in some restaurant. After this he asks the new friend to visit his 'Unique Library'. On reaching his room first of all he laments the loss of some of his 'wonderful' books, and then he brings some manuscripts and says that they were written by the authors in their own handwriting in order to present them to some Nawabs or Dukes. On seeing them once I asked him: 'How is it that both your Urdu and English handwriting is quite like the script of the manuscripts?' He replied that he liked the handwriting very much therefore he copied it some thousands of times and succeeded in adapting it to every detail. But there have been some people who thought that it was his own handwriting. He confesses that he had gathered together those invaluable jewels in the Jumarat Bazaar behind the City College. All his books are 'matchless' and the only remaining copies in the world. When the friend is disgusted with this 'Unique Library', Mr. Display very quickly changes the subject and then brings letters of some important persons written in his praise, but it is astonishing that the handwriting is everywhere the same,—the only difference is that of the ink. While unfolding them he says: 'Good wine needs no bush, what do I care for these recommendations? My ability will be the best recommendation for me.' Then he reads them aloud with a forced smile and sometimes falls into a fit of laughters saying: 'Professor . . . . 's style is very showy, I do not like this sort of writing. What is the use of all these bombastic words?' Finally he brings some ten or twelve nickel, copper and silver medals and puts them before the newcomer and declares: 'Some fifteen have been stolen which were of pure gold, and all of them I won in all-India competitions. Though in the Deccan I am not known to many people, in Upper India every literary man knows me thoroughly well. Nowadays I do not accept prizes or medals because I am tired of them; I simply want retirement and complete rest; but editors of newspapers and magazines do not let me have rest; and look here . . . . . ! you will not see my real name in the magazines because there I use only my pen-names. Sometimes I put only X after my

MR. DISPLAY

MR. DISPLAY is the most interesting fellow I have come across until now. He thinks too much of himself and as a matter of fact is the laughing-stock of the whole college. He thinks himself the best writer, the best scholar and the best orator the Osmania University has ever produced. Though a buffoon, he poses like a great philosopher. He says that some four or five of his books are ready in the press but he does not allow the publisher to publish them, and he is eagerly waiting for the proper 'season' (and it will never come); some of his books are out of print now (they were never printed and published). They are occupying very important places in India's big libraries. (But you will not be able to find out their names in the catalogues of the libraries.)

He is ever ready to answer any question put by any professor, and all class-masters of mine know thoroughly well that he fails ninety times out of a hundred. He tries his best to make an advertisement of his merits (though he possesses none).

He assures his friends belonging to the first and second year classes, that without any preparation and without paying much attention he can write a first class composition on any subject; but because there is nobody to appreciate his literary efforts he does not do so. He is dead against the editors of some very popular magazines. He is of opinion that their knowledge is very 'shallow'. I think they have neglected some of his masterpieces, and that is why he criticises them so severely. Though a student of the Arts section, he tries to talk down the students belonging to the science section on a scientific theory. He is very easily irritated and loses his temper even at the slightest joke. This quality of his makes him the concern of every student, for a chap of this bent of mind is very badly needed in the student-world.

Now coming to the proper subject, Ladies and Gentlemen, I was standing in the University of Oxford. One day my friend put me the question what Syntax was? I answered that syntax is a tax levied on sins. At that answer I was appointed as a Lecturer in Mathematics. A student asked me what is a^2-2b^2. I answered that a^2b^2 = Madras Whole^2. The student reported this matter to the Principal and he suspended me for a week instead of the student being suspended. To spend that week I have come down to India.

B. GOPAL MALLASHAM,
Student of IVth Year Class.

QUATRAINS

George Hirst

When I faced the blowling of Hirst
I ejaculated: 'Do your worst!'
He said: 'Right you are, Sid.'
And he did.

G. C. BENTLEY

Mr. Jones

'There's been an accident,' they said,
'Your servant's cut in half; he's dead!'
'Indeed!' said Mr. Jones, 'and please
Send me the half that's got my keys.'

HARRY GRAHAM

*

OXFORD UNIVERSITY LECTURES

I AM a doctor of history coming from Oxford. My name is Thumpington, a distinguished and dismissed member of the famous society of Leasington which is in Huntington. It was only two days ago that I had arrived at the harbour of Colombo from where I travelled by the S.I.R. Railway, which is otherwise called the Slow In Running Railway, and arrived at Egmore station in Madras. From there I was taken to the Clearance Hotel in Rangapuram in a two-wheeled Madras bullock cart which travelled at a uniform speed, or want of speed, of two miles an hour.

Now, Ladies and Gentlemen, before entering into the subject I wish to attract your attention to the following facts concerning my humble self. You must know first of all that I am a literary man, a medical man, a statesman, a pointsman, a man and a mad man. I know Philology, Zoology, Pathology, Psychology, Anthropology, Apology, Graphology and Topology. I know full well about IVth Form, Vth Form, VIth Form, Iodoform, Bromoform, Reform, Uniform, Chloroform, and the railway platform. I know something about the Commercial line, Geometrical line, Tramline, Railway line, and Vaseline. I know what is meant by fare, playfare, tramfare, welfare, prettyfair, trainfare, wayfare, warfare, and Madras Parkfair. I know something at least about Polltax, Landtax, Housetax, Syntax and the well-known Wall tax. I know everything about Dalton's law, Choul's law, Bose's law, Charli's law, Martial law, brother-in-law, sister-in-law, and ever useful Umbrella.

I know almost everything about Mechanism, Buddhism, Jainism, Feminism and the present Brahminism.

Finally Ladies and Gentlemen, I have knowledge of Astronomy, Autonomy, Bigonomy, Metonomy, Gastronomy, and at the same time about Metaphor, Camphor and Christopher who discovered India.

It was a most pleasing spectacle!

* * * *

I got into the room, signed against my name, took the sheet of paper on which were written the names of those who stood for various posts in the Union, and forgetting for the moment all that the canvassers had said, I exercised my own discretion.

I think I heard someone saying: 'It is very often that your judgment is wrong.' I don't know how mine was!

IFTEKHAR AHMED,
B. E. (1st Year).

AN OLD EPITAPH

Here lies
Sir John Guise;
Nobody laughs,
Nobody cries.
Where he has gone
And how he fares,
Nobody knows,
Nobody cares.

best writing fluid in the world, and when every manual of physical culture is the only treatise in the world which makes the body perfect,—is it not vital that every one possessing reason should look to his own commonsense, should try to see the facts in their true colours and decide upon what is verity and indeed the right course to follow? In all cases of Elections, not only in the small compass of a University, but everywhere in the world where public opinion is sought, it is only the brave spirit that dares to be 'in the right with two or three.' What a profound baseness it is when we change our opinion, when one is our friend, when one treats us on several occasions or when one's election lies in our selfish, personal interest!

The great stir about Elections has nevertheless a salutary effect upon social intercourse. For a fortnight at least the sons of the University are imbued with a true spirit of brotherhood.

The freshers from High Schools have a great chance of coming in contact with the 'Seniors' who move about with important airs. They are compelled to give the Juniors 'a lift', thanks to the elections. More acquaintances are formed in a few days, more salaams begin to be interchanged than would be expected in a whole academic year. The very atmosphere seems inundated in a flood of enthusiasm, life and activity.

* * * *

The ninth, that memorable day of Shehrewar, 1344 Fasli! It has created in my memory an indelible impression. Who can forget that Babylonish jargon issuing forth from an educated, neatly-dressed multitude before the Union Hall? What sight is more jovial than the laughing, happy crowd of bristling youths, exerting their last effort to win the voters to their side? It was indeed delightful to observe how greatly the sound of crackers, when they were used before the hall, comported with the pyrotechnic blaze of the throng's enthusiasm. The poets, from among the students of course, composed couplets on the spot which were quite pat for the occasion. Flags were snatched from students who were going to survey the surrounding fields, and were converted into emblems of their particular party.

the main buildings. It is the 'one-to-two P.M.' resort of day scholars—sincere seekers after knowledge to whom distance matters little—who gather there in large numbers every afternoon, furnishing the tables with vanishing decorations of bread and butter, tea and toast. So large is the number of visitors that it is often difficult for them to get a seat and even more difficult for the scanty number of waiters to serve those who are already seated. I was sitting at one of these tables when a student of my acquaintance, with whom I had such a close friendship that I did know his name, came and sat beside me.

After talking to me on different topics 'preliminary to particular conversation' he began to speak upon what was naturally his object in opening conversation with me. 'I am not concerned with any of the two parties' he went on, referring, of course, to the two 'Ministries' (and this very remark set all my belief in his neutrality at defiance), 'and yet . . . . . .' But it is not really boring to write his explanation which must have been repeated to so many? Nor is it essential to mention that his concern with one of the parties was betrayed by a friend of mine saying to this unconcerned eloquent person; 'Don't bother, he is one of us.' And I think I was.

Five minutes had passed and I was half-way to the college when a strange voice from behind was heard saying: 'Would you mind giving me a few minutes with you?' I had no objection and was prepared to believe in whatever he would say.

This continuous strain of arguments for and against a party had confused me very much. My decision was at this stage a regular see-saw upon the extremities of which sat two 'Ministries', never failing to carry it down alternately.

But have I not a decisive power of my own to discover the deserving, the really capable soul from out of the gathering mist of scandal spread around him? Do not I, does not any human being possess a reason, a sense of judgment to distinguish right from wrong? Specially in these days when every film produced is better than the previous one, when every ink manufactured is the

WHAT I DID!

THE experiences of an insignificant voter 'Congratulations, Mr. M.' said I as I stepped into the drawing-room of a friend of mine. He was just the type of a made-in-Hyderabad young Osmanian—full of youthful enthusiasm, fond of fashionable society, a good speaker and a person of brilliant academic career. Possessing these qualifications and having distinguished himself in the field of sports, it is no wonder that he should be very popular in the University.

He had just finished his undergraduate's course with merit in two subjects (and hence my congratulations) and this was perhaps the reason why I spied an added freshness in his face. He smiled graciously as he rose to greet me, closing the book he had in his hand, which I subsequently learnt to be a novel by Sydney Hosler. 'Very glad to see you, old chap,' he began, 'after such a long vacation. I believe you had a . . . .' He had scarcely finished his sentence when I felt like interrupting him. I had glanced at something which at once raised in my ears a cry of 'Ministry, Elections, Votes.' It was a pamphlet by the workers of the '. . . . . Ministry' congratulating the successful matriculation candidates and inviting them to the University College with solicitations 'to vote for persons who most deserved', the deserving personalities, with their respective qualifications, being no doubt enumerated in the pamphlet. My friend explained my curiosity. 'I am working for the . . . . . Ministry' and it is my business to distribute these (pointing to a huge bundle of coloured pages) to those who will come and join the College.

I was told enough. I could see the Shadow cast by the coming Election.

* * * * *

The Nizamiah Restaurant is an oblong piece of tin-work, situated on the outskirts of the University area, a furlong from

of course, her virtues are counted too. A perfect feminine figure devoid of such virtues as love, modesty and chastity is but an artificial flower without any perfume, and, therefore, not worthy of regard or admiration.

The one-sided, materialistic view of beauty is bound to create corruption and demoralization among women as well as men. Signs to-day strengthen the belief. Where and to what the present beauty competitions will lead womanhood in the West, time alone will show.

MOHD. YAKOOB,
III Year.

AND THEN THESE

God made the world in six days, and then He rested. He then made man and rested again. He then made woman, and since then, neither man, woman, nor anything else has rested.

AUTOLYCUS VIII

Unfolded only out of the illimitable poems of woman can come the poems of man.

WALT WHITMAN

The woman could tempt the man easily enough ; but it took the very devil to tempt the woman.

SARAH GRAND

Woman, in your laughter you have
the music of the fountain of life.

RABINDRANATH TAGORE

AN APPROACH TO A BEAUTY QUEEN

I WISH I were a judge at an international beauty competition where I could feast my eyes upon the faces and figures of such varied and celebrated beauties as are styled Miss France, Miss Italy, Miss England, Miss America and a host of others, almost in a state of nature.

I wonder how I should feel and act, if at all I were so fortunate as to be left for a few minutes in the presence of Miss Universe. Whether, on such an occasion, I should be all eyes or be simply dazzled or stunned by the glamour, beauty and fascination of the most graceful, the most lovely, in short the most perfectly beautiful womanly figure in the world, is more than can be predicted now.

However, one thing is certain. There could be no gainsaying that Miss Universe, according to most up-to-date standards and under the light of latest investigations in the science of beauty by 'beauty experts', would be the best 'specimen' of feminine beauty in the world.

Therefore beauty, it appears, is what can and should be weighed and measured these days in order to standardize it. So are the ways of judging beauty at such competitions in the West.

The fair contestants have to wear masks for fear of being too prepossessing and consequently impairing the judgment of judges. What counts most with the judges is lines and contours and not looks, charm or appeal. All this shows that the so-called Miss Universe will be aptly the most perfect figure instead of the most beautiful woman in the world. Beauty is not mere physical fitness or perfection. To me, beauty is far more comprehensive a word. Even when we take into account looks and the general effect of the whole body in estimating beauty, such a woman could scarcely be called the most beautiful woman, or a beauty queen. She may be decorated but cannot be admirable, unless,

our grief. On the next day we took leave of him and with the ashes of Shanta returned to the dark bungalow. My wife did not enter it. That very night we left that place and went to Kashi to offer the ashes of our darling Shanta to the Holy Ganges.

'The kindness and hospitality shown by the Curator will never be forgotten and the doctor's kindness too will be remembered for ever. However the ashes were put into the Ganges. My wife since the day of Shanta's death has never been happy, though I tried my best to please her. A few days after cholera broke out in our country and Mohan also went to play with his sister in the heavens. On the fourth day of his death his mother left me for ever and went to look after her two children. My youngest daughter is now four years old and is under the care of the old servant woman. She loves her like her own child and Kamla also regards the old woman as her own mother.

'My life is full of misery and misfortune. I distributed my wealth among the poor and *patashalas* and temples. I do not move in any company. Every morning and evening I go to the banks of Mother Ganges and shed tears upon the flowing graves of my deceased relatives. Every year in these days I come here to visit the place where my daughter enjoyed her last play. The change in my life in these three years is indescribable. These vicissitudes of life have shown me that misfortune never comes alone. This is my story and now let me go.' Saying this he got down from the car but I caught hold of him and asked him where he was staying, to which he answered that he lived in the village of Ellora caves in a temple, and added that he would go to Benares after three days. We urged him to come with us to Aurangabad, but he refused. So we asked him to allow us at least to take him to the temple. He consented and we left him at the temple. He thanked us and entered the temple. Then we returned to Aurangabad. It was nine o'clock at night when we reached there. All the way we were talking about this sad meeting.

SYED MOHD. WALI,
Junior B. Sc.

oh ! in an ins . . . .' He now began to cry vehemently and tears gushed forth from our eyes also.

Now it was night and the cave had become quite dark. So we asked him to come outside and finish his tragic tale. When we came near the entrance he pointed towards the tank in which his daughter was drowned. It was really dark and dreary. When we came out we saw moonlight spread all over the plain. We went to our motor car and sat in it and he continued :

' She was drowned before my own eyes. Babu ran to the Curator of the caves and told him. The Curator was a mild gentleman. He hastened up with two servants and without any hesitation asked one of them to jump into the water and search for the girl. He jumped into it without even removing his clothes and after a long search came empty-handed and said that he could not find her. The Curator again urged him to search. He again jumped and after fifteen minutes came with Shanta's dead body. Her mother was lying quite senseless upon the floor; Babu was standing aghast and I was quite unable to know what was going around me. Meanwhile many people gathered around us. There was a Parsee doctor among them who came and after examining Shanta said sorrowfully : "No pulse." I had a little hope that she would be living, but woe for me, she was no more.

' My young men ! I cannot express the sorrow I felt at that time. You cannot understand it. You are perhaps still bachelors and do not know the sorrows and miseries of life and specially the grief of a child's death. May God keep you always happy and healthy.

' The Parsee doctor soon brought my wife to her senses. Babu was drowned as it were, in the flood of his own tears. However the Curator took us to Ellora village and there in the evening we burnt her body, and spent that night in the Curator's quarters. He treated us with all respect and frankness. He kindly offered us some fruit and sweetmeats, but we could not eat, and he also politely did not compel us to do so. All the night none of us could sleep except the little baby. The Curator also spent the night with us, condoling with us and trying to lighten

walking she twice slipped and fell down but did not cry. Sometimes she took the baby from her mother and sometimes climbed upon the shoulder of the maid-servant, who loved her very much. She slept there upon her shoulder. This girl, Shanta, was loved by all in the house. Her elder brother Mohan, whom we called Babu, loved her more than anything. He would bring her dolls and toys from the fair in Benares and always played with her in the house.' Here he sighed and after a few minutes continued.

'When we came out of that hall into the surrounding compound and went into another room in the same cave, Shanta woke and coming down from the maid-servant's shoulder, caught me by my finger and asked me to take her upon my shoulder. A little after she got down and then we all came out of the cave and sat on the bank of the tank situated before the entrance of the Kailasa. The servant woman brought some water from the tank and we washed our hands and faces. Shanta sprinkled water upon us with joy and she also went down with the servant woman to bring water in her little glass. The water she brought in it she gave to none but me, and I, though not willing, drank it. It was one o'clock when we came into the cave in which I am now telling you my tale. In this cave near the entrance there is a tank which is, though smaller, yet deeper and darker than the first near Kailasa. Here we spread our food to eat. We had brought with us some fruits and sweetmeats. We all began to eat. Shanta took an apple in one hand and a *luddoo* or sweet-ball in the other and ran here and there joyfully in the cave. The maid-servant went to bring water from the tank. Shanta also went running with her and brought water in her little glass and gave it to me. I drank it and she again began to play.

'We were busy in eating and talking and thought that Shanta was playing, but all of a sudden I heard a cry: "Abba, abba. I . . . ." This was Shanta's voice. We all ran towards it. It was coming from the tank. I went there and saw Shanta drowning in the water. Her hands were raised for help. But

'I have met with hundreds of people like you,' said he, 'who came and asked me the cause of my weeping. When I related my story to them they also burst into tears. Why do you put yourself into trouble by hearing my story? Please go and see the cave and enjoy yourself.'

'Our curiosity about you,' we said, 'does not allow us to leave this place without hearing your story. Though the night is coming fast and we have to go very far, yet we care for nothing but to hear your story.'

'If you are bent upon hearing my tale of woe,' he answered, 'please sit down here, for it is a long one.' Accordingly we sat down upon the floor which was shining like a mirror. Sitting upon his own place thus he began his story:—

'My dear gentlemen, I was a rich and noble man in Benares and every one esteemed me. Three years ago I made up my mind to come here to see the old architecture and the greatest temple in India. So in the winter holidays I started from my house with my wife, three children, and a maid-servant. I had one boy of twelve and a girl. . . .' Here he sobbed and tears trickled down from his eyes. At that time it struck my mind that the girl might have died. We condoled with him in gentle words. Then he began: 'A girl of seven and a baby of one year only. We broke our journey many times on the way and wanted to go to Nasik while returning from here. However we came here quite safely. We took a room in the Khuldabad dak bungalow and on the next day we came here in a motor car. My girl whom I loved the most and who always followed me like a shadow and loved me more than her mother, was overjoyed to see the wonderful giant-like rock-cut pictures of Kailasa. She put me innumerable questions as: "Papa, have you ever seen such a big elephant and have you met with such huge persons?" I would answer just to keep her quiet: "Shanta! the old people and animals were bigger than we and these elephants were used by our gods." Thus she was satisfied. When we entered the central hall in which the floor is more slippery and shining than that of this cave in which we are sitting, she laid herself down and rolled from this wall to that while

MISFORTUNE NEVER COMES ALONE

IT was in the last winter when we set out to see the Ellora caves. We started in a motor car from Aurangabad at 7 A.M. It was not the first time for me to see the caves, but my companions who had come from Hyderabad had not seen them before. On the way we stopped at the Daulatabad Fort. My friends were much amazed to see the wonderful fort, wholly built upon a solid rock, which looks like a Dreadnought from afar. We had brought a torch and a camera with us. We took some photos in the fort. We spent there nearly half a day and thought it better to take our dinner in the fort. Accordingly we sent our motor driver to bring our tiffin box from the car and some sweetmeat from the shops which are kept temporarily in these days. When he brought us all those things, we began to eat and gossip in the Bara Dari from where we could enjoy the surrounding prospect. Exactly at 1-30 P.M. we started from the fort to the Ellora caves. On the way while climbing the hill which lies between Daulatabad and Ellora the axle of our motor car broke and it took full three hours to repair the car. I wanted to return to Aurangabad, but my friends insisted upon going to the caves. So we went to Ellora and reached there after 5 P.M.

First of all we saw the best and the biggest cave No. 16 called Kailasa. We took some photos by the permission of the Curator, for he was my friend. Then we entered the next cave on its left side. At that time the yellowish light of the sinking sun was peeping into the cave through the entrances. As we advanced farther the cave grew darker. We lighted our torch and went on. In a corner we saw an old man sitting with his head under his knees, leaning against a wall. On seeing the light, he raised his head and I saw tears sparkling in his eyes in the light. By the dress he seemed to be a person living in the temple, but I thought that there must be some reason for his sitting there alone. I made up to him and asked him the cause.

When I saw my friend, after cracking some old jokes, I told him that I had seen a very beautiful girl. It seems that he was of the same nature as I was, because he at once desired to see her. To gratify his desire, I took him near the carriage where the girl was sitting. My friend was very much amused by my action. He told me that he would go and talk to her. I strongly disagreed, warning him that he would endanger himself by his childish action. But he would not listen to this and went to her. To my great surprise, when the girl saw him, she smiled and for a minute there was some private talk between them. When my friend returned, he told me that he would offer her a *pan*, which is very, very shameful in Muslim eyes. I told him that it was quite impossible. So there was a bet of five rupees between us which I at once gave him. He went to the girl, took a *pan* and brought for me also which I ate with great pleasure; but very soon I spat it out as it was very, very bitter and sour. It seemed that some quinine had been mixed in the *pan*. I was very much pleased with the fun of this girl and praised her very much before my friend for which he offered me countless thanks but I did not know the reason why he did so then. In the train he told me that he would take this girl and marry her as she was travelling alone. Upon this I cautioned him of the dangers he was putting himself in; but he never cared for it and at Bombay station, he brought the girl. I stood amazed and the girl came and shook hands with me; at the same time my friend told me that the girl was his wife and his words produced in me perspiration. But he was a man of jovial temper; he was always cutting jokes at my foolishness; and I, in great humiliation parted from him very soon.

S. JAFAR HUSAINI,
Senior B. A. Class.

A MISTAKE

BEFORE relating my experience I want to assure my reader that I am not a scoundrel or an ill-natured chap. I have immense love for beauty and admiration for everything which shows the slightest sign of beauty. Being of such nature, I should not be considered strange, but on the contrary one should admire my nature. The more beauty a thing has, the more love it wins from me. It is my belief that benevolent nature has been extravagant enough to exhaust its fund of beauty for the sake of woman. That is why I always love women and everything that has a womanish countenance. If at any time I see a lady passing, I follow her for some distance in order to enjoy her beauty. If at any time I go to the theatre (and fortunately I happen to see there most charming faces), the beautiful actresses dwell in the world of my imagination for a long time.

Now sir, some sagacious philosopher has truly observed that extremes should be avoided. The extreme love of beauty once brought upon me a great misery of shame and humiliation. Once it happened that when I was going to Bombay ; at Gulbarga station I saw a girl who was very beautiful, sitting in the zenana carriage. I stood on the platform and began to gaze at her charming face. I could not see her lovely dress as she had put on a great black cloak. Her face was open as if she wanted to see the crowded station. I would have stood near her carriage till the train had started again, had I not been disturbed by my one old and intimate friend who was bound to the same place to which I intended to go.

Now here I want to mention something about Indian customs. In Europe, women are eager that one should praise their beauty. There tell a woman even of ordinary beauty that she looks killing and she bridles up and likes her admirer very much. Unfortunately in India the case is quite the reverse. If you tell an Indian woman that she is very charming, in great fury and anger she will give you a slap.

sitting on the twig of an orange tree in our garden, but to my surprise, only an orange fell down and I do not know what happened to the pigeon shot at and how it could fly away.' 'And yet another time' he said 'I only blinded a duck with my rifle, which lived for one year and died a natural death. So in the light of all the aforesaid courageous deeds he was not a coward. 'How can I be', the fat one enquired, 'when I witnessed ten dead tigers, lived in a thick jungle for one full day and full night, wounded a bulbul in its left leg, shot an orange instead of a pigeon, blinded a duck that lived for an year after it was shot, and above all hit our controller-friend when induced by you?' I assure you I could not control my laughter. We stopped on the way and laughed for one complete hour. He would not keep quiet. He said, that we were perfectly unjustified in calling him a coward. He revolted.

He cut many a joke on our way home. We came counting the milestones on our up-journey. The total distance we walked was three miles and a half.

The sublime moon, after having witnessed all our activities, was waning slowly as we reached the hostel.

KHAJA NASRULLAH,
Senior B.Sc.

the twinkling stars around her, the rippling rivulet's flashing near by and the shining sands surrounding us.

Suddenly a dark cloud crossed the fair visage of the glorious moon and disturbed us. When we looked at our gold-rimmed watches, it was past two.

Once more tea and biscuits were served and then we rose to return. Some of us ascended the hill-tops to have a last look at those soldiers. They were not there.

Then we proceeded to our 'Ever-Ready' trolley. Now it was a hard task to take the trolley home, so far as the up-hill task was concerned. Force applied, it ran smoothly. All that we had to do was to push, push on, push it on until a slope was gained, whence it darted forth like a fish in water. All energy spent, we got exhausted in pushing the trolley up-hill and resolved to foot the distance. We marched in single file.

On our way home we smelt a strange smell. A friend said; 'There must be a "cheeta" (leopard) living near by.'

Our fat friend who had the honour of being called a 'bandicoot' was walking at the extreme rear. The moment he heard the word cheeta he ran fast and created a place for himself in the middle of the party. Our kind leader called him a coward and quoted Shakespeare's most inspiring lines; 'Cowards die many times before their death . . . etc. with a view to make him bold and courageous. Upon hearing this he retorted that he had seen ten tigers shot dead by his Collector friend at Midnapore and that he had lived in a big jungle with his twenty friends who used to say that the cheeta is the most cunning animal. It could not be shot by his Collector friend, who made several attempts to no avail. That is why, he said, he feared cheeta most. He, then gave us an incident wherein a child was the victim of a cheeta. We burst into laughter at his very irrational argument. Our leader remarked ironically: 'So, tigers never kill men.'

The other then grew grave. He observed: 'As for myself I hurt a bulbul in its left leg when I wanted to kill it actually with an air-gun of my younger brother, who, I am sorry, is no more.' 'Not only this,' he went on: 'I once aimed at a pigeon

words. They seemed to have been entertaining all sorts of mishaps about me since I left them. The incident seemed to have affected them deeply. With cheerful faces did they advance to embrace me as though I had come unto this world by a process of transmigration of souls. They were extremely glad that I reached them all O. K. I craved their pardon again. I promised I would not leave them again. They begged me not to take ill what they said, as it was all for my own good.

Our pleasure-loving party had become serious, but the efforts of the comic elements among our midst successfully won the party back to its original happy mood.

The atmosphere was serene and calm. The hovering moon was at her zenith. There was no rustle in the wind, as though it had calmed down to hear music from us. There was music in the flow of streams and harmony in the atmosphere: everything was in keeping with our mood.

Our mood regained, a perfect musician from among us seized his harmonium that was lying uncared for till now, and began to play upon it. Another friend took out the cups from the attachés and began to serve the hot vapour of odorous tea, along with biscuits. By turn did he serve us all. Meanwhile the soul-elevating music was being played and we all felt we were somewhere near God where there is music, nothing but music all around. It is said: 'Music is the language of the angels, nay, the language of God Himself.' Not for nothing did Orsino say: 'If music be the food of love, play on.' So did we play until Nature seemed swayed by our sweet songs. Our souls were touched: we were like hypnotised beings. Readers, do you doubt? If you do it is only because you were not present on that occasion. It excelled even the music of the Golden Temple (Gurudwara) of Amritsar. The fact is even Nature enjoyed our music. To me Heaven is a state of great calm and highest elevation of mind. I, nay, all of us, felt we were within Heaven.

Drowned in the wine of music, the universe as a whole was to me all serenity, sublimity, beauty, harmony, and, above all, music. With its reigning beauty, the moon sank in the blue sky,

drenched only to invoke sympathy in them and thereby get more tea. I assure you, it was all an accident.

All of us proceeded to sit on the glittering sands and do justice to the biscuits. On our way to our left at about twenty yards were noticed four obscure human figures; they were lying on the ground with their faces turned downwards and their guns parallel to them giving an appearance of soldiers in a trench ready for action.

At first sight we could not believe they were really men for, believe me, it was an extremely cold night and the desolate place with the gushing waters nearby was not a befitting place for love-lunatics, for such they were.

We were rather shocked at this unexpected sight. We, hedonists, would have advanced in that direction but for the advice of some. I, who am ever inquisitive about such things, and who wanted to be adventurous and learn the real state of things, left the party to its fate and myself made for the 'soldiers'—of course Indian. To my astonishment and great surprise I perceived a profusely feminine form tearing off as it were from among their midst and disappeared in the distant desert.

My hair bristled and I stood speechless. I don't know how long I stayed there like this, when all of a sudden I felt icy hands clenching my neck. I cannot tell you how I felt then. A voice, 'Stay where you are!' I stayed and shivered from head to foot. Here was the same generous man, who had lent me a helping hand on the previous occasion. He went on: 'Don't you see we are not armed as they are. We don't have even an air-gun or a shaving blade with us. Moreover they appear conscious of the crime they are up to, and have come prepared to meet any emergency.'

My breath was coming fast and I muttered: 'Thank God, you are none of those criminals over there.'

I then followed my benefactor like a lamb, because by this time I was fully convinced of his good intentions.

I was then introduced to the party as an outlaw. I apologised for my misbehaviour. But none seemed to pay any heed to my

sari, the dazzling light of the hurricane lantern held up to her face by her delicate lovely hand that makes even sculptors go mad, were things that captivated my heart. All senses gone, I was a true 'roboto' now. To me she is now a thing of the vanishing past. The trolley pushed to the front producing a rhythmic jingling sound.

We lost sight of them and they of us.

Our engineless saloon crossed two more bridges almost simultaneously. Soon the railway came to an end. We got down as though our destination had been reached. To our surprise we noticed we were on the banks of the river Musi. In between the banks were gushing waters on one side and beds of sand on the other. I went down the sudden slopes of the sandy bank and was about to step into the water that looked like a lovely lawn. A friend cried from behind.

'Halt! A step further and you are drowned.' It was too late. I could not check my speed and I had already plunged into the stagnant water just beside the rushing torrent. A shiver ran through my frame that was all along kept warm by various scientific and unscientific devices. I was now standing in mud and water half knee-deep, with my shining shoes completely drenched and fixed in mud and the lower border of my long overcoat (which was handed down to me by my good old grand-father) completely immersed in water. I feared to move either way for fear of slipping further.

The same generous man who had warned me a second much too late lent a helping hand saying: 'Didn't I warn you? Appearances are deceptive.' Turning to the party he beckoned to one and all to witness me in my pitiable plight. He did not pull me up though he had already lent his hand to do so. All assembled and, I, made a butt of vulgar and urbane wit, was pulled up with some ceremony. They laughed like devils. Their life-lengthening laughter, their lungs-expanding cries I also enjoyed.

After I had come up, I changed my clothes and was given a cup of hot tea from the thermos. Some whispered that I got

and ultimately turn the trolley turtle. So, ours was the business to sing as loudly as possible and not to move from our reserved seats.

We were half reclining on the sides of the trolley. We could peep into the rippling rivulets flowing by. It looked as though tons and tons of mercury were flowing from some unknown source. The magic of the silvery moon was to transmogrify everything into something very attractive, very beautiful.

This scene too remained not long.

We advanced. Now the scene was a sort of Sahara. Everything around looked deserted. There in the moonlight we perceived in the open air some cartmen beside their carts fast asleep, covered only with rough rugs. A strange feeling came over me. I envied their life in this particular. I wondered how their skins could become cold-proof, and how they could enjoy sound sleep in that biting cold when we, with all our woollen garments and Kashmir shawls, shivered like grass at every gush of wind. I always envy these men cut in ebony! What a symmetry, what physical perfection! I always marvel at them.

We were now past the miniature Sahara.

Our four-wheeled smooth-running saloon, because of the continual slope, moved on ceaselessly. A queer thought struck my friend at the sight of the beautiful buildings on our way. He suggested to us to chant funeral prayers. All approved of the extraordinary idea and our triumphal march suddenly changed into a funeral procession. We wantonly slowed down our 'Ship of the desert' and began chanting mournfully. The voice fell on the ears of the innocent inmates of the neighbouring houses. They came out and gazed at us with stupid solemnity. These were the most trying moments for us, for our slightest inclination towards laughter would have made our behaviour questionable.

In the midst a door creaked and there peeped an angel. Her eyes forcibly opened as it were in agitation to see us, her temple locks flowing over her rosy cheeks, her aquiline nose thrust outside the slighty opened door, her fairy slender form clad in a pink

his head. Thereupon he was soothed and joined us in our laughter.

We sang in a melodious voice as we went on.

After some time we came across a silent city and noticed a board with the following words on it. 'Labourers' Camp No. 4.' The slum population seemed to me the happiest human beings on earth. No police to guard them as they had no fear of being robbed by anybody. The small huts looked beautiful to me. The labourers were fast asleep, forgetful of what the upper class were up to.

Our sweet songs awoke them from their deep slumber and some rushed out and some perhaps, for fear of cold, were content to peep through the crevices to see what on earth could be the source of music in the dead of night—for such was the hour for them. There was one Mark Tapley—an invincibly cheerful person—in our midst, whose laughter was perfectly contagious. We were soon under the grip of this epidemic and actually convulsed with laughter.

Our trolley now passed through a cutting. The side rocks on the two sides were simulacra of the Eastern and Western ghats which reverberated with our enchanting music, preparing perhaps all the distant dogs to bark at us in vain and lulling those that lived by the sweat of their brow to sound sleep.

The Fairy Queen of the night—the beautiful moon—was peeping through the canopy of greenery as if anxious to illuminate her love-lorn lovers' lonely lawns. An indescribable charm prevailed in the shady passages! Erase it from my mind I never can.

This scene remained not long.

We had yet to cross some bridges. Now the controller was very careful. He slowed down for fear of our trolley being derailed. It may be he was nervous, or he thought 'robots' might feel nervous.

I venture to call myself and my mates 'Robots' because we were warned by our expert controller not to make any unnecessary movements that were calculated to check the speed

iron projection outside the roofless open tub we were in, with a view to controlling the speed of our 'whoop-ship', having only tea instead of cheap wines on board. (In America cheap wines are available on board the whoopee-ship, which is like a floating-club).

'Ready?' asked our captain.

'O. K.' replied all of us in a chorus.

'Righto,' said he, and instantly the trolley was in motion. A slight push from behind by the assistant controller and the trolley glided down the slopes in the sanctuary of moonlight.

Now and again the controller had to stop the trolley with a view to taking a definite route, for the railway branched into side lines almost at every furlong. The trolley stopped, the controller used to call a committee at the shortest notice, which after a careful consideration of the case issued orders to him (controller) as to the particular route he had to take. The line that appeared crinkum-crankum was usually voted for. So did we proceed to a place unknown, undiscovered as yet.

While in the trolley a novel idea struck me. I took a pen and paper and wrote down :

'To stop trolley
Knock slowly,'

on parallel lines of

'Pull chain
To stop Train,'

and pinned it on to the controller-friend's head-gear. Soon after a friend from inside the 'compartment' knocked on the controller's head. He would have fallen down but for the iron rod that was serving the purpose of a brake. Immediately he stopped and growled indignantly, 'Fool, who was it? You, bandicoot'—pointing to a rather plump and dark friend among us who was the culprit. Every one of us laughed and explained to our angry controller that our friend's action was in accordance with the rules of the trolley expedition, and we all pointed to the note on

OUR TROLLEY 'EXPEDITION'

WHAT a whoopee-ship is to the Americans, a trolley is to the hostel students.

The full moon nights are the nights set apart for our trolley expeditions. The number of students is always limited ; twelve is our maximum.

We put on warm clothing as the nights are extremely cold. Some of us looked like the Mount Everest expedition carrying thermoses full of fragrant tea instead of oxygen cylinders, and some appeared like John Bull carrying hand-bags full of cakes and biscuits.

Our university area is a network of railways. We can travel in a trolley for a full day without crossing and re-crossing the same way. We experience no drab monotony in this pleasant pastime.

Our expedition started at 10 p.m. We noticed a mighty segmented monster of an earth-worm consisting of several trolleys linked together. We selected one having efficient brakes. With considerable difficulty we unloaded the sand it contained because we knew nothing as to the way it toppled over. Anyway our first summit of difficulty was overcome and we heaved a sigh of partial relief. We were engrossed so much in the work before us that we looked to neither side. Now being free, a friend turned round and whispered :

'Hush ! Look there. Our warden is coming.'

Suddenly we made a move from there, and proceeded like mourners pulling long faces.

Our kind warden thought it well to retire. Joy of joys! we were back again at the trolley.

A tall apparently capable friend took charge of the brakes. All of us got into it with the exception of two, who stood on an

arguing very boisterously and at the same time every now and then embracing each other and muttering words of love and endearment. As I neared them they began a struggle and one began accusing the other of some debt that he had not paid. Seeing me pass one of them approached me and taking hold of my hand—in a grip as of a vice—asked me to decide between them. Helpless as I was, there was no way out but to do as they wished. The explanation began. The plaintiff said that the accused had, the day before, taken Rs. 6 from him and that for 6 months he had not returned the money. The reply of the defendant was that he agreed to the point of having taken the money the day before, but it was only 4 months and not 6 as the other had said. Now it lay with me to decide as to what one should do to the other. But bolting from the place seemed to be the best thing for me. I just edged into the accuser, who got into such a rage, that his feet not supporting the weight of his anger, he collapsed. This made him loosen the grip he had on my arm. I am an opportunist and did not miss the chance to imitate the rabbit. What I last heard again was an exclamation of delight from the two and looking back I saw them again locked in an embrace.

SHEHEREYAR KAUSJI,
Senior B.A.

THE OLD THORN TREE

I recalled other trees which had affected me and how, long years ago, when a good deal of my time was spent on horseback, whenever I found myself in a certain district I would go miles out of my way just to look at a solitary old tree growing in a lonely place, and to sit for an hour to refresh myself, body and soul, in its shade. I had, indeed, along suspected the thorn of being one of this order of mysterious trees; and from other experiences I had met with, I had formed the opinion that in many persons the sense of a strange intelligence and possibly of power in such trees is not a mere transitory mental state but an enduring influence which profoundly affects their whole lives.

W. H. HUDSON

AN INDIAN TREE

'The Tree of Mirth and Ruin'.

THIS is a very common type of palm tree in India. The Europeans call it the Toddy tree. We call it the 'Sendhi ka Jhar' and curse or bless it according to our temperament. It grows straight—unless too much of tapping sometimes makes it swerve from the straight line and become like the waist of a ballet dancer in motion—and has a scaly shaft crowned with a crest or bush of long leaves going in all directions and having pointed fluted petals.

This tree plays an active part in the life of the country. It is a great source of income to the Government who bring it under the excise laws, because the juice of this tree is the staple drink of the majority of the worshippers of Bacchus in India. Then it is also a source of income to the 'Kallal' or the toddy vendor. Again it supplies money to the tapper, whose dangerous task it is to climb this 'pillar of infamy' supported by only a leather belt which goes round him and round the tree. But the greatest joy that this tree affords is to the labourer, who after his day's task in the burning sun or pouring rain, earns his wages of eight annas and goes straight to the 'Sarkari Compound' and spends at least half of it upon this 'Drink of Gods'.

The irony begins on his return home when the neighbours are entertained by his free broadcast of abuse, songs, philosophy and physical culture.

A nice instance of the effect of this toddy juice may be worth relating. This instance will show that the toddy drinker 'though defeated can argue still'.

One night I was returning from the cinema (second show of course). It was past midnight and the moon was shining brightly. As I reached a place where two ways meet, I was attracted by a couple of men standing in the middle of the road,

They are akin
To life that stirs
The stars, those trusty
Wanderers.

They are as one
With wave and breeze,
With cleansing sun
And sheltering trees.

Mahmud Gavan
Knelt him down
To a drunken king
In Bidar town.

Not one of all
That crew around
Knew they watched
A true king crowned.

Mahmud Gavan
Bowed his head
And entered life,
But they are dead.

But Mahmud Gavan
Has a tomb
A child could leap,
Of infinite room.

A bed on earth
In a swift-dug hole,
For honour, worth,
And the depth of his soul.

No thick walls guard him,
Bolts nor bars,
He lieth open
To the stars,

Outside the glory
Of the city
Left to Heaven's
Eternal pity.

In Bidar is no such
Holy place
Of all the valiant
Northern race.

Bidar ruins are
Grand and great,
But even they
Must fall to fate.

This lonely grave
That lies apart
Abides for ever
In the heart.

For goodness, loyalty
And faith,
They lie beyond
The reach of death.

MAHMUD GAVAN OF BIDAR

E. E. SPEIGHT

MAHMUD Gavan
Under a tree
Sleepeth very
Quietly.

Sleeps the sleep
Of a martyr there,
With friendly roots
Around his lair.

Like a worn-out steed
Tired of the throng
He has laid him down
To rest there long,—

To rest on the wide
And windy heath,
With the stars above
And the stones beneath.

With a tree to wave
Green arms above
His lonely grave
In laughter and love.

The Bahmani lords
Of Bidar town
With their dripping swords
And their dead renown.

Their tombs like bubbles
Swollen stand,
Like empty bubbles
Blown and bland.

simpler than the protoplasmic stuff of life, which is found in all living cells. Protoplasm could only have been built up by slow stages, by miraculous chances, by combinations lasting over untold ages.

When more is known of these specks of life, which seem so often the seeds of death, it may be possible to say that they are the missing links in the chain of life. They may be made of something even simpler than protoplasm. This may prove to be so and yet if the story of all knowledge repeats itself, it is more than likely that when discovery is pushed further into the structure and beginnings of these strange invisible creatures, it will find a stage beyond, still unconquered and unexplored. The boundaries of life will be extended, but they will be seen stretching to the limits of the universe, and it will appear that life is part of that infinite realm with which it began, and with which alone it ends !

C. M. MACHAYA

FROM THE SPANISH

Figures in the fields against the sky !
Two slow oxen plough
on a hill-side early in autumn
and between the black heads bent down
under the weight of the yoke
hangs and sways a basket of reeds,
a child's cradle.
And behind the yoke stride
a man who leans towards the earth
and a woman who, into the open furrows,
throws the seed,
Under a cloud of carmine and flame.
in the liquid green gold of the setting,
their shadows grow monstrous.

ANTONIO MACHADO

The one thing common to germs is that they never seem to do their host any good, which is perhaps why they have been noticed. There may be other invisible specks of life, all unknown to us, which are doing us the highest service, spreading health instead of disease, and laying low microbes which would hurt us.

Most germs are alike in being, extremely small and extremely simple in structure, the size varying in a general way. It may be said that in size they are no bigger than a quarter of a millionth of an inch. This does not convey very much to us, but it does give us the impression that they are extremely small, that there is no room in them for anything more than a simple structure. It seems probable that these minute specks exist, both as ill-doers and well-doers, in all sorts and conditions of life.

Next to nothing is known of them, though knowledge is growing. Whatever structure they do possess cannot be revealed by any method now known, though it has been discovered that certain kinds of light will destroy them. That, at any rate proves that light has an enormous influence on their stucture. If light can break it down, perhaps light in another form can build it up. Perhaps life began when light began! It is only a step from that to believe that life began with the universe itself, and that living matter and dead matter are of the same age, for ever distinct from one another.

Some imagine, that such non-living things as oxygen, carbon, nitrogen, phosphorus, can be started by light and heat and electricity into a combination, which would be a living thing. Why not, they ask? For the protoplasm, which is the stuff of life, in all living things, consists of just those elements. The materials of life are everywhere about us. The answer would be that, perhaps far-off in the beginning, two or three of these elements became linked together by the electrical forces of nature, and then took on some other essential helper, till at last something which had the attributes of a living thing arose!

Life is beyond the wit of any man alive, but all are agreed that the earliest forms of life must have been far simpler than any microbe we can see with the microscope. They must have been

together. If so its beginning must have been the result of some miraculous coincidence. It must have been a junction of dead elements, in such proportion and in such a way as could only happen once in a million million times.

Yet, on the other hand, if it happened once, it might happen again, and it is quite possible, that materials may be coming into combination again to form a living thing today, this very hour, this very second. We cannot see or know it is happening; yet may it not be that, unknown to us, life in its simplest form is beginning somewhere around us, beginning somewhere on an earth specially fitted for the continuance of life when it has begun?

Where shall we seek for these beginnings? Not in the bacteria or the protozoa, or in any of those creatures which the microscope reveals to us as alive, though they are made up of no more than one cell of living matter of protoplasm. They are sometimes called the simplest living things, but they are in fact, like man himself, fearfully and wonderfully made.

The farthest back we can go in the line of living things is to something that the eye can never see but that is known to be alive. Quite lately it has been shown that these forms of life exist, and 'exist as separate bodies'. Before these discoveries it was known that there were life-forms which were too small to be seen, but behaved like living growing things. It was uncertain whether they were something resembling an invisible mass of life—or whether each had a separate individual existence.

The wonderful photographing microscope exposes objects to ultra-violet light and photographs them even when they are too small to be seen by ordinary light through any microscope. It reveals to us these moving specks as living separate things. These specks of living matter are the invisible foe in many common maladies. Many diseases of men, animals, and plants are caused by these or similar specks of life. They are not all the same by any means, and we know that from their behaviour. Some of these germs do not produce disease directly by their own poisonous activities, but they cause a kind of anarchy in the living cells of the animals where they are found.

MOVING SPECKS BEYOND THE MICROSCOPE

'SEEING IS BELIEVING,' says the old proverb, and if we study the progress of knowledge we shall really always find that a step upwards is taken by some men through power of vision. A new idea of the skies arose, when the telescope enabled Galileo to gaze on them, and it may be said that a new world of life burst into men's gaze when they first looked through the microscope.

Every now and then it seems as if a halt has been called and the world declares that the limit of vision has been reached, and the way barred to further progress on the old lines. But no sooner is that stage reached, than some man with vision, which is not of the eye, but of the mind, finds another way round, and proves to the world that the limit of the powers of the human intellect has not yet been reached.

It has been so with the telescope, which, when it seems to have reached its zenith, was helped by photography to higher powers. So also has it been with the microscope, which, during the last four hundred years, has revealed specks of life so small that they were invisible in any ordinary light.

The power of search which lies in man's instruments is like an allegory, for it seems to show that what has hitherto eluded his senses is often more important than what strikes them. Let us now look at some discoveries of invisible germs, which may yet pave the way to a knowledge not hitherto attained, of the causes of disease, if not of the mysterious processes of life itself.

How did life begin? Had it better a chance of beginning, when a mantle of vapour wrapped the earth, or did it begin when the earth had the same heat and light, air and water as now? Our minds, however scientific, cannot grasp every possibility, but it seems to most of those who think deeply on this question, that life was a special gift of God, something created anew, and not something allowed to come into being by joining elements

and so it happened. We were on the platform, the clock-hands were pointing to 3-32 and the train was already gone.

We stood silent for a while, then walked hither and thither, asked this man and that, but to no use. My companion burst into laughter and I joined him unwillingly. 'Yes, here we are'! said he 'and we have to attend the meeting.' 'Certainly' said I sarcastically. 'Come along' he said, 'we will walk all the way. It is three forty-five. Never mind, come along.' He started running, as I must say, and I followed him. We went on running along the railway, talked little on the way, and kept one idea in our mind, one goal before us—to reach the College as soon as possible. How soon was it possible? I wondered and God only knows how we gained the goal, for it was only four-fifteen when we arrived. The president of the Union was garlanding the ex-Principal, as we stepped in, and thanks to the unpunctuality of the Union, we were fortunate enough to take part in the cheers in honour of the ex-Principal.

G. A. MUJADDADI,
III Year.

THE NAMES OF FLOWERS

Did you ever stop to think that the names of diseases and the names of flowers are very similar?

For instance, I might say: 'Do come and see my garden. It is at its best now, and the double pneumonias are really wonderful. I suppose the mild winter had something to do with that. I am very proud of my trailing phlebitis, too, and the laryngitises and deep purple quinsies that I put in are a joy to behold. The bed of asthmas and malarias that you used to admire are finer than ever this summer, and the dear little dropsies are all in bloom down by the lake, and make such a pretty showing with the blue of the anthrax border behind them.'

SUSAN ERTZ

MY EXPERIENCE OF PUNCTUALITY

MUCH is said about the value of time and much have I read of it, but little do I believe or realise of it. To be punctual is good, I know, and so I am taught. Still to bring the knowledge into practice and to do what we are instructed to do is not always an easy matter. So in spite of all my knowledge, it is hard for me to be as punctual as I should be. Recently I had a bitter experience, and hence I know better how valuable time is—how valuable every minute is.

Our college was going, one Sunday, 'to ring out the old and ring in the new', that is, to say good-bye to its former Principal and welcome the Pro-Vice-Chancellor. The function was an important one and I had to attend it. To be in time I had only one train, at 2-26, otherwise there was no other train to enable me to reach the college at four o'clock.

With my companion, I came out from the house at 2-20 and we walked as fast as we could to cover the distance of two and half furlongs from the house to the Malakpet station in six minutes. Hard it was to do; we tried our best, reached the station, ran straight on to the platform, stood there, but the train had gone! I looked at my watch and it was 2-28, we were two minutes late.

'What shall we do'? I asked my companion, and he repeated the question to me. What to do we knew not; to be late two minutes meant to be late two hours, and to reach the College at a time when there would be hardly any one left. My companion, at last, was wise enough to suggest to catch the bus from the Residency Kothi and go to Secunderabad station, so that we might reach the College by an up train. So we started, and reached the bus station. But again we were late, and the bus had just started. We waited there ten minutes more, then by another bus started for Secunderabad at three o'clock. It left us at 3-20 in Rani Ganj and now again we had to run as fast as possible to reach the station at 3-30. We never expected to do it,

Well knows the Bay of Leghorn how it was
He met his end while plying at the oar.
His soul went up in sacrificial fire
On Virgil's and Catullus' native shore.[1]

SYED ZAHIRUDDIN AHMED BABAR

[1] P. B. Shelley.

ON SHAKESPEARE

Shakespeare had many superstitions, but his belief was in himself: out of that self he made his system, which moves us all profoundly, whatever creeds we profess. In that system man is warned, like Caesar, but follows his own fate; he is tempted, like Macbeth, but is misled by his own wisdom. He is ruined by his own generosity, like Lear or Timon; he is of a passionate credulity, like Othello: but in all these shapes man lives and dies by what is strongest in himself.

JOHN MASEFIELD

There is no moral lesson to be read, except accidentally, in any of Shakespeare's tragedies. They deal with greater things than man; with powers and passions, elemental forces, and dark abysses of suffering; with the central fire, which breaks through the thin crust of civilization, and makes a splendour in the sky above the blackness of ruined homes. Because he is a poet, and has a true imagination, Shakespeare knows how precarious is man's tenure of the soil, how deceitful are his quiet orderly habits and his prosaic speech. At any moment, by the operation of chance, or fate, these things may be broken up, and the world given over once more to the forces that struggled in chaos.

SIR WALTER RALEIGH

POETS I LOVE

TEN poets who sweet-numbered descants sang,
Severed remorselessly by death's decree,
Scattered they rest as faded blossoms lie,
Glorious in their last humility.

One a poetic treasure-island holds,
Upon his grave the wind has ever piled
The forest leaves; the native he can mark
His cross among the brambles of the wild.[1]

One, bless his soul, was of a tender heart,
And tears upon a grave-yard softly shed,
Most learned of his time, when low, at last,
Was in the very country churchyard laid.[2]

One piping on a lofty Highland hill
Had wondrous tales of chivalry to tell.[3]
One a Poet Laureate, on his comrade's death
Rang with a heavy heart the mourning bell.[4]

One, hailing from Snowdon's valleys, harped
A sad, sad lay in full soprano strain;[5]
And England's sweetest, wisest talker passed
At Highgate, singing of the Southern Main.[6]

One was a captain, courtier of the Queen,
So plentiful the harvest that he reaped,[7]
By him lies the singer of Kentish tales,
The urban earth upon his coffin heaped.[8]

On Wessex Downs oft has the rustic seen
A hoary ghost beneath the gloomy trees,
When Casterbridge's saddening vesper bells
Serenely echo across the moaning seas.[9]

[1] R. L. Stevenson. [2] Thomas Gray. [3] Sir Walter Scott.
[4] Lord Tennyson. [5] Felicia Hemans. [6] S. T. Coleridge.
[7] Edmund Spenser. [8] Geoffrey Chaucer. [9] Thomas Hardy.

After this I had the opportunity to visit this man several times. I was also able to reap some advantage out of my association with him. But it is simply monotonous for me to see one of the most learned professions of the world overrated in this way.

MIRZA SARFARAZ ALI,
Senior B. A. Class.

N.B.—The names and characters in this essay are fictitious.

CUTLETS

1. A man said that there were not ten men in all Boston who could have written Shakespeare's plays.

2. A traveller at a certain dak bungalow complained about the milk. They told him it was camel's milk, as there were no cows in that region. So he replied, 'If that is the best the camel can do, I suggest that it stops giving milk and takes to laying eggs.'

3. When Mark Twain was editing a paper, in an answer to a correspondent he recommended fish food, and after considering the contributions offered by the correspondent, indicated as his proper diet two whales—not necessarily large whales, just ordinary ones.

4. A doctor was inspecting a mental hospital which he had visited before. He recognised an old acquaintance.

'Well, my friend,' he said, 'and who are you now?'

'Julius Caesar,' was the reply.

'But,' said the doctor, 'when I was last here, you were Henry VIII.'

'Yes,' said the patient, 'but that was by a different mother.'

There sat beside me men of all descriptions. They had very interesting accounts to relate.

'Well Khan Sahib,' said Mr. Hasan, addressing a giant-like man in the assembly, 'it was with great difficulty that I could succeed in your case. The witness was merely a miserable fellow devoid of common sense. Only I could have managed the matter after that dilemma!' (Emphasis on the last sentence, so much so that the room rang with his voice.)

'I cannot thank you in words sir!' said Khan, 'you are my saviour. Justice demands that I serve you as a bondsman throughout life.' (There was a mutual understanding between the lawyer, his clerk and the simpleton who had already been made an easy victim.)

'Now you, sir,' Mr. Hasan accosted a fashionable man, 'so, your case will be placed before the court on Sunday next—let me see—25th of July. Very well then. You see, my car is under repairs. I request you to be good enough to manage about a taxi.'

'As you like, sir' said the man in perfect obedience. Looking at the clerk's beseeching eyes, 'Well, Munshi Sahib, I have not forgotten you. Please see me tomorrow at eight in the morning.' (To the lawyer) 'May I go now, sir?'

'So, young man, what do you want now?' He now spoke to me.

As a preparatory measure I opened my mouth to speak and was not quite successful in the attempt. I said half stammering, 'Sir, my mother has asked me to come to you.' 'So, it is kindly done, Sir, I promise every sympathy and attention in your case. But, one thing sir, . . . your . . . father did not pay for my petrol last time. Wou-l-d you be kind enough to bring about fifteen rupees tomorrow morning. I would not speak of it but that the month is nearly at an end. So good-bye, sir.'

I left him, thanking my stars that I had escaped from that abode of treachery mixed with a very small amount of honesty. The very faces of the man and his clerk denoted greed,

A VISIT TO A LAWYER

MY conception of things has very often come true when people spoke of the talents of certain famous personalities, like Tagore, Iqbal, Sapru and others who have international fame. I formed a vivid picture of them in my mind and to my great joy I was not the least disappointed.

In my infancy, Father spoke of Aziz Hasan, a High Court pleader, as a very intelligent, courteous and learned man. He very often visited him in connection with the withdrawal of our Jagir which had been handed over to the court since my grand-father's death.

Death lays its icy hands on kings, and father had soon to submit to it, leaving the case incomplete.

Now it was my turn to settle matters. For the first time I tapped at the door of Mr. Aziz Hasan, file in hand.

The house which was built in European fashion had been furnished according to the same taste. It was really a very fine building, exhibiting all the requirements of the dwelling of a cultured man.

Soon after sending my visiting card, I was called in.

There sat an elderly man who had perhaps seen more than fifty summers. His countenance was grave and his eyes hypnotising. The room was awe-inspiring to a young visitor like myself.

'Hallo sir!' growled he, 'are you the same gentleman's son? I am very sorry for him, poor gentleman, your father. Sure, he was a very nice man, sir! You see Munshi Sahib, he is Mirza's son.'

'Oh is he?' was the grim reply from a hoary-headed man sitting in front of him, in shabby clothes and old fashioned spectacles.

I was kindly asked to sit down and I, who was not myself till then, resumed my seat with a beating heart,

They are both anti-parliamentarian, but not with the same objects. Communism is anti-parliamentary because it holds that parliament cannot establish a classless society. Fascism is anti-parliamentary because it regards parliament in its modern democratic forms as incapable of serving any longer as an effective instrument for the preservation of class distinction and the nationalist idea.

Communism though it is yet nationalist is in a real sense cosmopolitan.

SYED ABDUL HALEEM,
B. A. (*Osmania*).

TRANSLATIONS FROM THE ITALIAN

1. Without tradition and historical criticism, the enjoyment of all or nearly all works of art produced by humanity would be irrevocably lost; we should be little more than animals, immersed in the present alone, or in the more recent past.

BENEDETTO CROCE

2. They had ended their work of tying up faggots in the vineyard, and all, old and young, stayed awhile in the sunset light; and white heads and fair and black heads gleamed under the clouds on fire. They were listening to the cuckoo, to the two limpid echoing notes of the spring evening, notes so remote that they seemed unreal, so near that they seemed to sound in their hearts.

GIOVANNI PASCOLI

3. So thine admirable beauty, the reflection of that righteousness with which heaven is adorned, shown to men on earth by the eternal Artist, while fading as time passes and age comes, will imprint itself deeper and deeper in my soul, for I shall ever see it through that Beauty which no age nor winter can impair.

MICHELANGELO

Dictatorship can be used for the preservation or destruction of class differences. According to the objective the system will be conducted. If the elimination of class distinction is required with the establishment of democracy the ambit will have to be broadened and all the elements excepting those injurious to dictatorship will have to be abolished, just as in Russia the Communist will have to admit the Socialist also.

Fascists who preserve and do not obliterate class differences will have to be on their guard not to allow democratic and proletarian elements to get the upper hand in the formulation of policy. Indeed it is necessary to expand a party to get large support, but it is also essential to form a party authoritatively rather than on democratic lines. It is necessary here to have a leader because a Corporative State always requires a Duce or Führer, who is the ultimate fount of authority and party inspiration. On the other hand Proletariat dictatorship abhors the idea or a leader. It may canonize Lenin when Lenin is safely dead, of canonize Dr. Sunyat Sen under the same conditions. But it will not canonize Stalin or Chiang Kai Shek, however much power it may in fact allow to these living leaders.

Because communistic dictatorship tries to eliminate class distinction, so it has to take all the institutions under control so as to produce and distribute wealth equally. Fascism which preaches unequality has to be content with distribution of wealth according to economic laws. So it need not take all the industries under control, but must exercise supervision and see that no policy may be detrimental to the State, and leave these things in private hands. It is quite clear that the scope is much wider under Proletariat dictatorship than under Fascism. So far as there is any capitalistic class it will have some influence on society and true dictatorship cannot be achieved. So there are fundamental differences between these two forms. Fascism does not want any drastic change. Communism wants to adjust the lives of the people according to Marxian theories and it has a direct influence on society. Where Fascism aims at preserving old institutions that are threatened, Communism seeks to establish values that are new.

One is allowed to write or say anything about a matter which is unsettled as yet, but as soon as it is decided, nothing can be urged against the settlement. Such obstinate and dogmatic policies have prevailed in other constitutions also, but only in religious matters and not in politics. This does not mean that freedom entirely disappears, but it is canalised and an anomaly will result in serious punishment.

In parliamentary systems the weight of opinion is led by an elected party which forms the majority. But in dictatorship the dominant party is always influential and is given more importance than any other influence. It is always supposed necessary in dictatorial forms to control those vulnerable points through which some opposition may creep in. Control and paramountcy are maintained, and an eye is kept on everyone who opposes the government.

The question of representation is conceived differently under a dictatorship. Parliament is individualistic in that it depends upon single votes. Under a dictatorship individuals are not given chances to influence the public policy. They think of groups which are under influence and are given importance. The aim of Communism is that the Proletariat should dominate the country till nothing is left except proletaries, and a classless fraternity exists. Fascism divides the group not economically but functionally, in relation to government according to their functions. This conception underlies the idea of the Corporative State, which is an attempt to organize all the various functional groups within society in subordination to the political State as the organ endowed with the overriding functions of co-ordination and control. Thus neither Communism nor Fascism represents the individual but the groups who share the framing of public policy.

These were the similarities in the post-war dictatorships. As already said, according to their policies they will be either destructive or constructive in their ends. A surgical knife can be used to cure a man or to kill him: strychnine is a tonic as well as poison. The same motor car can be used to carry you to Quilon or to Quetta.

Under any form of dictatorship parliament becomes uninfluential and unimportant. With the advent of the Soviets the Duma was swept away, but in Italy and Germany parliament still exists. Germany has abolished her upper Federal House and in Italy it exists in a semi-fossil state. It has remained only to promulgate acts which have already been sanctioned or to ratify legislation which is already approved. Strictly speaking it has been abolished, as in Austria, and the lack of it would make no difference to the working of the State system. Parliament has become in the Fascist countries the fifth wheel of the coach, and not even the spare wheel of the motor car. It has no real place in the operative system of government.

The party which has become dominant is more constitutionally important than the party in power under a parliamentary system. It becomes the most important organ of government policy. In Italy the Fascist Grand Council, and not parliament, is now the real legislative body. Likewise in Russia, though on paper the ultimate authority belongs to the Congress of Soviets, yet practically the policy-building and law-making is done mainly in the conferences and through the machinery of the Communist party. But in Germany the party is not so influential as in Russia or Italy. That is because in Germany the personal influence of the dictator has been more predominant than anywhere else. So the party is supposed only to carry out the orders of the leader, and not to influence his policy. But we cannot tell anything with certainty about Germany as nothing is settled there yet. Even now there are persons who are influential enough, like Goering and Goebels, and are supposed to exercise much influence on their leader, though till now the leader has led his party autocratically. Yet he cannot go on in this way without a strong party to back him.

The discussion of public issues takes a different channel in dictatorship. Though it is true that no parliamentary system gives complete freedom to the Press, yet a rightful agitation is allowed under defined limits, which is naturally an outcome of controversial parties. But under dictatorial government one can speak freely supporting the dominant party and not opposing it.

helpless individuals in fear cling to any force which appears to be in a strong position, and they submit to the influence of a dictator however malign, lest a worse befall.

This is a general outline which may help in understanding the following pages, in which all kinds of dictatorships are discussed.

Dictatorship was a movement reactionary towards existing constitutions, especially parliamentary systems. So when we divert our attention from the existing constitution and bring into consideration those which are grouped under the name of dictatorship, we find vast differences, to which none of the existing political theories can be adequately applied. It is not because this movement is new; on the other hand such forms are found in past history. It is because modern tendencies have been so much in the direction of parliamentary system that it was ignored altogether.

There are two main kinds of dictatorships, one that is found in Russia and the other in Italy. The former is called Proletarian, the latter Fascist. The latter is also found in Germany and Austria. Though there are similarities, yet it must be remembered that they are contrasted and antagonistic in their nature; similarities are found only on the surface.

Apart from these two dictatorships there are other kinds which cannot be grouped with either extreme. Turkey and China are one-party States, backed up to a large extent by military force. There are other States in Europe which are approaching dictatorship, though they are not governed by a party but by a Crown, which still aims at governing by autocratic methods. Jugoslavia and Rumania both belong to this type, and so did Spain up to 1931, under the dictatorship of Primo de Rivera. Hungary is in a somewhat different position, in that she is ruled authoritatively under a regent instead of a king. Poland again is different, in that in her case the dictatorial institution has been in the hands of Marshal Pilsudski and his group of generals, acting within the frame-work of what is still in form a parliamentary republic. Now we shall take individually Russia and Italy as the typical representatives of Proletarian and Fascist systems.

DICTATORSHIP

POST-WAR Europe has been a laboratory of new experiments in the art of politics. Before the end of the war, Russia had led the way, passing in her two Revolutions of 1917 swiftly from Tsarist autocracy to the dictatorship of the proletariat. In Germany the Bismarckian system had begun to crumble sometime before the military collapse; and there had been concessions to popular sentiment which helped to prepare the way for the new order. The complicated political adjustments of the Austro-Hungarian Empire had lost their perilousness long before 1918. And finally the German occupation of Poland and the confusion of the other territories raised in an acute form the question of constitution-making for the brand-new States. During the last year of the struggle between the Allies and central Powers civil war went on side by side with international war; and civil war raised everywhere the problem of the organisation of government. In short Europe was plunged in an orgy of constitution-making. At the same time it must be remembered that the statesmen were not fully aware of the drastic changes through which every country was passing, so they tried to adopt the old methods which were quite inadequate for post-war Europe.

The war had subsided and democracy was coming to man's rescue. But what happened? It gave way to dictatorship. If autocracies had yielded place to republics, democracies now began to disappear before dictatorships. By 1930 there were many dictatorships in existence. They were of different forms. One, in Belgrade, was monarchical, and another, in Angora, presidential, others in Madrid and Warsaw were military. A dictatorship of party in Moscow. As they were different in form so they were in ends. Some constructive, some destructive and some both. It is also said that there was one in Washington too. But it was only in potentiality and unless backed up by Congress, could not transform itself into actuality. All revolutions tend to dictatorship, simply because, in the dislocation of the social order,

expression. It is quite true that we cannot make bricks without straw.

To put the whole thing into a nut-shell, we must acquire this language to the end that it may help us in making the current Sciences our own.

An Economic Survey of Hyderabad is an immediate need for us.

Students of the Osmania University can easily avail themselves of this opportunity. The District Officers are found very hospitable on such occasions. We hope that they will give us the opportunity of paying our tribute to them frequently. Sahibzada Maikash, Basit Baig, Azizul Haq, A. A. Khan and Ghazi already made such a tour last summer and deserve our congratulations for their productive enterprises in the hot June days.

It is our pleasant duty to offer Dr. Itrat Husain Zubeiri, a former Editor of the English Section of this Magazine, and a State scholar, our hearty congratulations on his remarkable success in a foreign University.

'He has quite recently been awarded the Carnegie Scholarship of £250 for two years by the Edinburgh University for higher research on 17th Century English Poetry. He is the first Indian to be awarded this Scholarship.' (Special Cable, London, Aug. 6th, 1935.)

Another of our Old Boys, Syed Wahiduddin, who had such a distinguished career with us, and who has been enjoying a scholarship awarded him by the German Government, is entering upon the last year of study for a doctorate at the University of Marburg. He has had the further honour of being given a home by one the greatest of living philosophers, Prof. Rudolf Otto, of that University. Mr. Wahiduddin has also travelled widely in his vacations, visiting Sweden, Italy (where he had interviews with the philosophers Croce and Gentile), Sicily, where he studied the remains of Arabic civilization, and Tripoli where he studied Italian Colonial administration.

MIRZA SARFARAZ ALI,
Editor.

FOREWORD

IT is a general belief that students of the Osmania University are behind others in writing and speaking good English. But we know for certain that this statement has now become a dead letter. Our students here and abroad have made a figure on many a trying occasion.

Still, we must realise that there is no smoke without fire. The fact that most of us are very shy and do not know how to show ourselves off to advantage is undeniable. Such inferiority complex in individuals robs the nation of its rights and privileges.

Now that the schoolmaster is abroad and the Government is trying its utmost to impart education to every son of Hyderabad, we must be cautious and energetic enough to make the best of it. To produce good writers of English is but a small part of what our Alma Mater expects us to do.

Most of the contributions in this volume are compulsory essays written by students in the classes.

Mr. Nasrulla's *Trolley Excursion* and Mr. Iftikar Ahmad's views about College elections are good reflections of our internal activities.

Prof. E.E. Speight, who burns his midnight oil in correcting hundreds of students' Exercises every month is generous enough to confess that we have a rosy future before us in this field.

Dr. Mackenzie, the man at the wheel of our University, aims at introducing a fully organized system of education in our country. The Nationality of Hyderabad is now passing through its transitional period; and schemes of this nature, if properly handled, will form a landmark in the history of our State.

Hindustani, India's lingua franca, is the only medium through which our country will reach its true goal.

The English language is enriched with first-hand information in all departments of knowledge and seems to be essential in endowing our Hindustani with all desirable modern forms of

PAST AND PRESENT EDITORS, OSMANIA MAGAZINE, 1927-35.

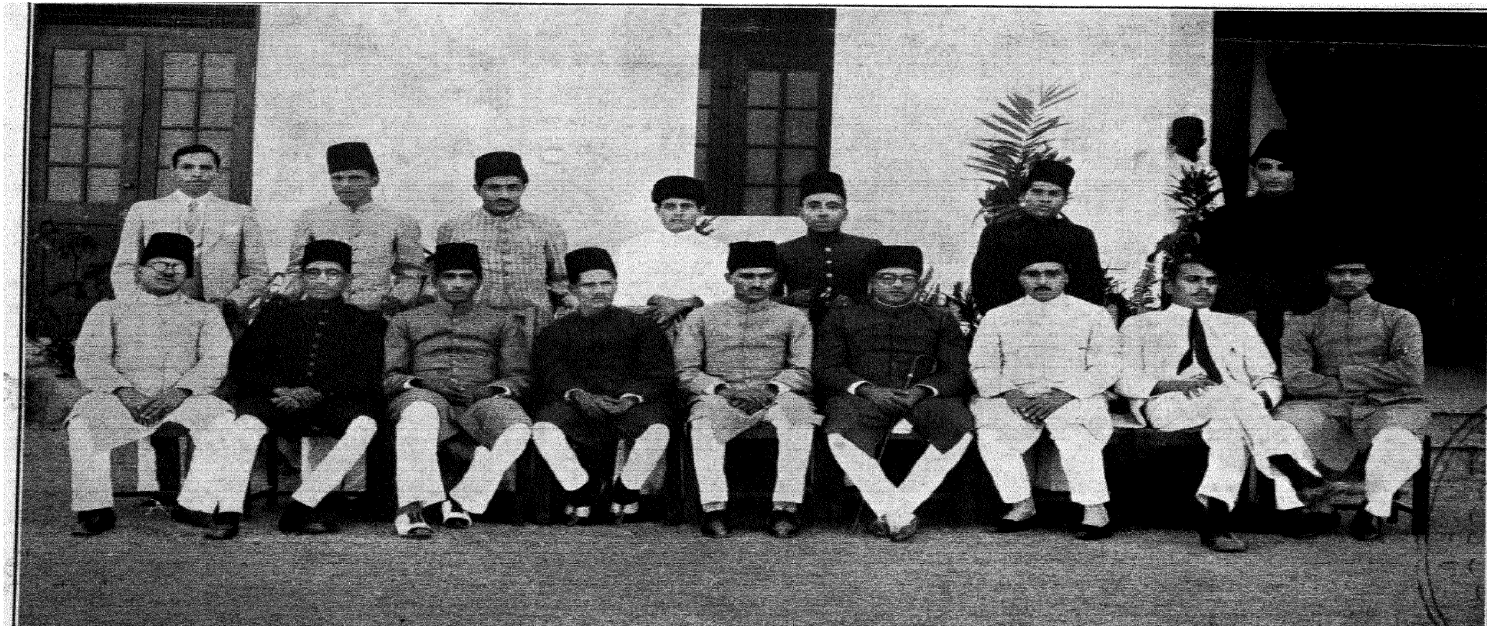

Right to left :—(Sitting) Dr. S. M. Q. Zoar, M.A., Ph. D. (London), Editor, Urdu Section 1927, (2) Mr. Moinuddin Quraishi, M.A. (Osmania), Editor, Urdu Section 1928, (3) Mr. Abdul Jalil, B.A. (Osmania), Editor, English Section 1928, (4) Mr. Akbar Wafa Qani, B.A. (Osmania), Editor, Urdu Section, (5) Mr. Shaik Chand, M.A. (Osmania), Editor, Urdu Section 1929, (6) Mr. A. Q. Baqi, M.A. (Osmania), Editor, English Section 1929, (7) Mr. N. H. Shameem, B.A. (Osmania), Editor, Urdu Section 1930, (8) Mr. B. N. Chobe, B.A., LL.B. (Osmania), Editor, English Section 1930, (9) Mr. Jalaluddin Ashk, B. A. (Osmania), Editor, Urdu Section 1929.

Standing:—(1) Mr. Hasan Asgar, Civilian, Asst. Editor, Urdu Section 1932, (2) Mr. Maqdoom Mohiuddin, B.A. (Osmania), Asst. Editor, Urdu Section 1934, (3) Mr. Noor-ul-Huda, B.A. (Osmania), Editor, English Section 1934, (4) Mr. G. M. Khan, M.A. (Osmania), Editor, Urdu Section 1934, (5) Saadat Ali Razvi, M.A. (Osmania), Editor, Urdu Section 1935, (6) Mirza Sarfraz Ali, Editor, English Section and Asst. Editor, Urdu Section 1935, (7) Mir Hasan, M.A. (Osmania), Managing Editor and Editor, English Section 1935.

CONTENTS

	Page
Foreword. By Mirza Sarfaraz Ali	71
Dictatorship. By Syed Abdul Haleem	73
Translations from the Italian	78
A Visit to a Lawyer. By Mirza Sarfaraz Ali	79
Cutlets	81
Poets I Love. By Syed Zahiruddin Ahmed Babar	82
On Shakespeare	83
Punctuality. By G. A. Mujaddadi	84
The Names of Flowers	85
Beyond the Microscope. By C. M. Machaya	86
From the Spanish	89
Mahmud Gavan of Bidar. By E. E. Speight	90
An Indian Tree. By Shehereyar Kausji	93
The Old Thorn Tree	94
Our Trolley 'Expedition'. By Khaja Nasrullah	95
A Mistake. By S. Jafar Husaini	104
Misfortune Never Comes Alone. By Syed Mohd. Wali ...	106
An Approach to a Beauty Queen. By Mohd. Yakoob	111
And Then These	112
What I Did. By Iftekhar Ahmed	113
An Old Epitaph	116
Oxford University Lectures. By B. Gopal Mallasham ...	117
Mr. Display. By Sikandar Ali Wajd	119
Another Kind of Collector	121
Lines Written on a Garden Seat. By G. Gascoigne	122
On the Above. By E. E. Speight	122
The Nature of X-Rays. By M. Karimullah	123
Prayer. By Mohd. Mahmood Hussain	126
Two Poems. By Shesh Rao	127
Man. By Babu Neel Ketu	128
Osmania. By Mirza Abbas Ali Khan	131
The Hag. By K. Moinuddin Siddiqi	133

The Osmania Magazine

Being

The Journal of the Students

of

The Osmania University College

EDITOR ENGLISH SECTION

MIRZA SARFARAZ ALI

Vol. VIII. *Nos. 3 & 4*

SEPT. 1935

TITLE PAGE PRINTED AT
CHANDRAKANTH PRESS
GOWLIGUDA, HYDERABAD-DECCAN.
INDIA.